آدابِ زندگی ﴿حصہ اول﴾

جلد: ۱۰

مفتی محمد تقی عثمانی

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴

(Quranic Studies Publishers)

آدابِ زندگی

جلد: ۱۰

مفتی محمد تقی عثمانی

ترتیب و تخریج
مولانا عنایت الرحمٰن

مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)
Karachi, Pakistan.

مواعظِ عثمانی

جلد دہم

عرض ناشر: الحمد للہ اگرچہ مکتبہ معارف القرآن کراچی نے "مواعظ عثمانی" کی تصحیح وطباعت میں ممکن احتیاط سے کام لیا ہے، لیکن کبھی کبھی کتابت، طباعت اور جلد سازی میں سہواً غلطی ہو جاتی ہے۔ اگر کسی صاحب کو ایسی کسی غلطی کا علم ہو تو براہ کرم مطلع فرما کر ممنون فرمائیں۔

باہتمام : خضر قاسمی

طبع جدید : جمادی الاولیٰ ۱۴۴۴ھ - دسمبر ۲۰۲۲ء

ناشر : مکتبہ معارف القرآن کراچی

ترتیب و ڈیزائننگ : عمران خان

فون : (92-21) 35031565, 35123130

ای میل : info@mmqpk.com

ویب سائٹ : www.mmqpk.com

www.maktabamaarifulquran.com

آن لائن : fb/onlinesharia

فیس بک سے خریداری کے لئے scan کریں

احاطہ جامعہ دارالعلوم کراچی، کورنگی انڈسٹریل ایریا، کراچی، پاکستان- 75180

آن لائن خریداری کے لئے تشریف لائیں۔

ملنے کے پتے

- مکتبہ دار العلوم، کراچی
- دار الاشاعت، کراچی
- بیت القرآن، کراچی
- مکتبۃ القرآن، کراچی
- بیت الکتب، کراچی
- ادارۂ اسلامیات، کراچی / لاہور
- مکتبہ عمر فاروق، کراچی
- قدیمی کتب خانہ، کراچی
- فخر الدین کانچ والا، کراچی
- مکتبہ اصلاح و تبلیغ، حیدر آباد
- ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان
- مکتبہ رحمانیہ، لاہور
- مکتبہ بیت العلوم، لاہور
- مکتبہ سید احمد شہید، لاہور
- الفلاح پبلیشرز، لاہور
- اسلامی کتاب گھر، فیصل آباد
- مکتبہ اسلامیہ، فیصل آباد
- مکتبہ صفدریہ، راولپنڈی
- اسلامی کتاب گھر، راولپنڈی
- مکتبہ عثمانیہ، راولپنڈی
- مسٹر بکس، اسلام آباد
- دار السلام، اسلام آباد
- مکتبہ رشیدیہ، راولپنڈی
- مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ
- دار الاخلاص، پشاور
- مکتبہ احیاء العلوم، کرک
- مکتبہ عباسیہ، تیمرگرہ
- مکتبہ احرار، مردان
- قرآن مجید محل، مردان

پیشِ لفظ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على رسوله الكريم وعلى آله وأصحابه أجمعين، وعلى كل من تبعهم بإحسان إلى يوم الدين

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہٗ نے بندے کو دارالعلوم ۱۹۵۹ء میں دورۂ حدیث کی تکمیل کے بعد ہی سے جمعہ کی تقریر کرنے پر مقرر فرمادیا تھا، شروع میں اپنے لسبیلہ ہاؤس والے گھر کے قریب عزیزی مسجد میں کئی سال جمعہ کی تقریر کرتا رہا، پھر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علالت کے بعد جامع مسجد نعمان لسبیلہ ہاؤس میں سالہا سال جمعے کی تقریر کی نوبت آتی رہی۔ ۱۹۹۹ء میں میرے استاد گرامی حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی جو جامع مسجد بیت المکرم میں جمعہ پڑھایا کرتے تھے اور ان کی تعلیمات کا فیض دور تک پھیلا ہوا تھا، اس موقع پر مجھے جامع مسجد نعمان لسبیلہ ہاؤس سے بیت المکرم منتقل کیا گیا اور وہاں ۱۹۹۹ء سے ۲۰۲۰ء تک جمعہ کی تقریر کا سلسلہ رہا۔

میرے شیخ مکرم حضرت ڈاکٹر عبد الحی عارفی صاحب قدس اللہ سرہ کی

وفات کے بعد میرے استاذ حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حکم پر میں نے لسبیلہ ہاؤس کی جامع مسجد نعمان میں اور پھر بیت المکرم میں اتوار کے دن عصر کے بعد ایک اصلاحی مجلس کا سلسلہ شروع کیا، اس وقت میری تقریریں محفوظ کرنے کا کوئی انتظام نہیں تھا اور نہ میں انہیں اس قابل سمجھتا تھا کہ انہیں شائع کیا جائے، لیکن میرے انتہائی مشفق دوست حضرت پروفیسر شمیم احمد صاحب (جو اس وقت ''معارف القرآن'' کا انگریزی ترجمہ کر رہے تھے) نے میرے معاون مولانا عبداللہ میمن صاحب سے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ ان تقریروں کو ریکارڈ کر کے قلمبند کر لیا کریں، چنانچہ انہی کی تحریک پر ان اصلاحی بیانات اور کسی قدر جمعے کے خطبوں پر مشتمل ایک طویل سلسلہ ''اصلاحی خطبات'' کے نام سے منظرِ عام پر آ گیا جس کی اب غالباً ۲۵ جلدیں ہو چکی ہیں۔

تجربے سے معلوم ہوا کہ بفضلہ تعالیٰ ان کی اشاعت مفید ہوئی اور حضراتِ ائمہ وخطباء بھی اپنی تقاریر میں ان سے مدد لینے لگے اور عام مسلمانوں کو بھی عام فہم انداز میں دین کی بنیادی معلومات آسانی سے پہنچنے لگیں، اس کے علاوہ بندہ کو مختلف مواقع پر کراچی یا کسی اور شہر میں، بلکہ کسی اور ملک میں بھی اس طرح کی تقریروں کا موقع ملتا رہا اور متعدد احباب انہیں قلمبند کر کے شائع کرتے رہے اور کسی خاص موضوع کے بارے میں انہی تقاریر سے متعدد مجموعے بھی مرتب کر کے شائع کیے گئے۔

مجھے ایک فکر ہمیشہ دامن گیر رہی کہ اصلاحی بیانات میں بسا اوقات واقعات اور احادیث میں صحت کا اتنا اہتمام نہیں ہوتا جتنا مستقل تالیفات میں ہوتا ہے، اس لیے میں نے اپنے احباب میں سے مولانا عنایت الرحمن صاحب کو اس پر

نامزد کیا کہ وہ میری تقاریر میں بیان کردہ احادیث یا سلف کے واقعات کی تحقیق وتخریج کریں اور جہاں غلطی ہوئی ہو، اس کی اصلاح کریں۔ میرے مشورے سے وہ یہ کام ماشاء اللہ قابلیت کے ساتھ کرتے رہے۔ مولانا عنایت الرحمن صاحب نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ ''اصلاحی خطبات''، ''اصلاحی مجالس'' اور بیانات کے مختلف مجموعوں کو بھی عنوانات و مضامین کی ترتیب سے مرتب کیا اور جو تقاریر ''البلاغ'' میں یا کسی دوسرے رسالے میں شائع ہوئی تھیں یا کسی کتاب کا جز تھیں ان کا بھی استقصاء کر کے ایک نیا مجموعہ ''مواعظِ عثمانی'' کے نام سے مرتب کر دیا اور اس لحاظ سے یہ بندہ کی تقاریر، مواعظ اور بیانات کا سب سے زیادہ جامع مجموعہ ہوگیا ہے اور حسبِ استطاعت اس میں تخریج و تحقیق کا بھی اہتمام ہے جس سے اس کے درجۂ استناد میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔

دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیزِ موصوف کی اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما کر اس بے عمل کے لیے ذخیرۂ آخرت بنادیں اور اس سے عام و خاص مسلمانوں کو فائدہ پہنچے۔ آمین

دارالعلوم کراچی ۱۴

بندہ
محمد تقی عثمانی عفی عنہ
۱۵/محرم ۱۴۴۳ھ

عرضِ ناشر

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم امابعد!

زیرِ نظر کتاب سلسلہ ''مواعظِ عثمانی'' جلدِ دہم ''آدابِ زندگی (حصہ اوّل)'' جو حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے خطبات، تقاریر اور مضامین کا تخریج شدہ جامع اور مستند موضوع وار مجموعہ ہے۔ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کو اللہ ربُّ العزت نے جو بے پناہ مقبولیت عطا فرمائی ہے وہ محتاجِ تعارف نہیں۔ حضرت والا دامت برکاتہم بیک وقت مفسر، محدث، فقیہ، ماہرِ معاشیاتِ اسلامی، مؤرخ، محقق، شاعر، ادیب اور مبلغ و داعیٔ اسلام ہیں۔ اسی دعوت وارشاد کا سلسلہ عرصۂ دراز سے ہفتہ واری مجلس کی صورت میں تاحال جاری ہے اور الحمد للہ اس سے بلا مبالغہ لاکھوں انسانوں کو فائدہ ہورہا ہے، جن میں غیر مسلم حضرات بھی شامل ہیں۔ اور اسی دعوت وارشاد کی برکت سے بہت سارے غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہوئے ہیں اور آج ایک کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔ حضرت والا دامت برکاتہم کے انہی بیانات ومواعظ سے علماء، طلباء اور خطباء کرام استفادہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ اور حضرت والا دامت برکاتہم کے جملہ بیانات ومواعظ تحریراً اور تقریراً عوام الناس میں مقبول ہیں اور ہر طبقہ ان سے مستفید ہورہا ہے۔

فاضل مرتب نے اس مجموعہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی

حضور ﷺ نے فرمایا	اصلاحی خطبات	اصلاحی مواعظ
اصلاحی مجالس	خطباتِ عثمانی	خطبات دورۂ ہند
درسِ شعب الایمان	نشری تقریریں	فرد کی اصلاح
اصلاحِ معاشرہ	تربیتی بیانات	ذکر وفکر

The Islamic months

اور اس کے علاوہ

- آسان ترجمہ قرآن • اسلام اور ہماری زندگی • انعام الباری
- تقریرِ ترمذی • جہانِ دیدہ • سفر در سفر
- دنیا مرے آگے • اسلام اور جدید معاشی مسائل • ہمارا معاشی نظام

کے منتخب مضامین، نیز ماہنامہ البلاغ اور دیگر مجموعوں اور رسائل میں شائع شدہ اور صوتی صورت میں محفوظ شدہ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کے بعض بیانات و خطبات کو شامل کیا ہے۔ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کی ہدایت پر اس کی تصحیح اور تحقیق کا اہتمام ہوا ہے۔ اس لحاظ سے یہ مجموعہ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کے خطبات ومضامین کا جامع اور مستند ترین مجموعہ ہے۔ اس مجموعہ کی ترتیب، تحقیق وتخریج حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کی ہدایت پر ان کی نگرانی میں مولانا عنایت الرحمن صاحب نے کی ہے۔ اس مجموعہ کی خصوصیات اور تحقیق وتخریج کا طریقۂ کار اس مجموعہ کی پہلی جلد ''ایمان وعقائد ونظریات (حصہ) اول'' کے شروع میں درج ہے، اس کی مراجعت ان شاء اللہ مفید رہے گی۔

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ اس کاوش کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور اسے ادارہ کے جملہ احباب ومعاونین کے لئے ذخیرۂ آخرت بنادے۔ آمین یا رب العالمین۔

خضر قاسمی (ناظم ادارہ)
مکتبہ معارف القرآن کراچی

فہرستِ عنوانات

اجمالی فہرستِ عنوانات

تفصیلی فہرست

کھانے پینے کے آداب احادیث کی روشنی میں

(حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کھانے پینے کے آداب احادیث کی روشنی میں

① حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''بسم اللہ کہو، داہنے ہاتھ سے کھاؤ اور (برتن کا) جو حصہ تم سے قریب ہو، وہاں سے کھاؤ''۔ (۱)

② حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جب تم میں سے کوئی کھائے تو داہنے ہاتھ سے کھائے اور پیے تو داہنے ہاتھ سے پیے''۔ (۲)

③ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

(۱) صحیح البخاری ۶۸/۷ (۵۳۷۶) طبع دار طوق النجاة۔وصحیح مسلم ۱۵۹۹/۳ (۲۰۲۲) طبع دار احیاء التراث العربی۔

(۲) صحیح مسلم ۱۵۹۸/۳ (۲۰۲۰)۔

''شیطان تمہارے ہر کام کے وقت تمہارے پاس رہتا ہے، یہاں تک کے کھانے کے وقت بھی موجود ہوتا ہے، پس اگر کسی سے کوئی لقمہ نیچے گر جائے تو اسے چاہیے کہ اس لقمے پر جو گندگی لگی ہو اسے صاف کرلے، پھر اسے کھالے اور اسے شیطان کے لیے نہ چھوڑے، پھر جب کھانے سے فارغ ہو تو انگلیاں چاٹ لے اس لیے کہ معلوم نہیں ہے کہ کھانے کے کون سے حصے میں برکت ہے''۔ (۱)

④ حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''میں تکیہ لگا کر کھانا نہیں کھاتا''۔ (۲)

⑤ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''دو کا کھانا تین کو اور تین کا کھانا چار کو کافی ہوجانا چاہیے''(۳)

---

(۱) صحیح مسلم ۱۰۶۷/۳ (۲۰۳۳).
(۲) صحیح البخاری ۷۲/۷ (۵۳۹۸).
(۳) صحیح البخاری ۷۱/۷ (۵۳۹۳).
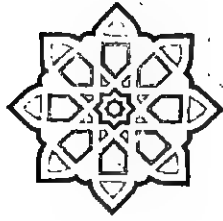
کھانے کے آداب

(اصلاحی خطبات ۵/۱۳۶)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کھانے کے آداب

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ اَنْ لَّا إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ أَمَّا بَعْدُ!

عن عمر بن ابی سلمة رضی اللہ عنہ قَالَ: كُنْتُ غُلَامًا فِيْ حِجْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَكَانَتْ يَدِيْ تَطِيْشُ فِي الصَّحْفَةِ، فَقَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ”يا غلام سمِّ الله وكل بيمينك وَكُلْ مِمَّا يَلِيْكَ۔“[1]

(۱) صحیح البخاری ۶۸/۷ (۵۳۷۶) وصحیح مسلم ۱۵۹۹/۳ (۲۰۲۲)۔

دین کے پانچ شعبے

آپ حضرات کے سامنے پہلے بھی کئی مرتبہ عرض کر چکا ہوں کہ دینِ اسلام نے جو احکام ہم پر عائد کیے ہیں وہ پانچ شعبوں سے متعلق ہیں۔ یعنی عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاق۔ دین ان پانچ شعبوں سے مکمل ہوتا ہے، اگر ان میں سے کسی کو بھی چھوڑ دیا جائے گا تو پھر دین مکمل نہیں ہوگا، لہٰذا عقائد بھی درست ہونے چاہئیں، عبادات بھی صحیح طریقے سے انجام دینی چاہئیں، لوگوں کے ساتھ لین دین اور خرید و فروخت کے معاملات بھی شریعت کے مطابق ہونے چاہئیں اور باطن کے اخلاق بھی درست ہونے چاہئیں اور زندگی گزارنے کے طریقے بھی درست ہونے چاہئیں۔ جس کو معاشرت کہا جاتا ہے۔

معاشرت کی اصلاح کے بغیر دین ناقص ہے

اب تک اخلاق کا بیان چل رہا تھا۔ امام نووی رحمہ اللہ نے ایک نیا باب قائم فرمایا ہے، اس میں دین کے جس شعبے کے بارے میں احادیث لائے ہیں وہ ہے ''معاشرت''۔ معاشرت کا مطلب ہے دوسروں کے ساتھ زندگی گزارنا۔ زندگی گزارنے کے صحیح طریقے کیا ہیں؟ یعنی کھانا کس طرح کھائیں؟ پانی کس طرح پئیں؟ گھر میں کس طرح رہیں؟ دوسروں کے سامنے کس طرح رہیں؟ یہ سب باتیں معاشرت کے شعبے سے تعلق رکھتی ہیں۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ

''آج کل لوگوں نے معاشرت کو تو دین سے بالکل خارج

کردیا ہے اور اس میں دین کے عمل دخل کو لوگ قبول نہیں کرتے، حتیٰ کے جو لوگ نماز روزے کے پابند ہیں، بلکہ تہجد گزار ہیں، ذکر و تسبیح کرنے پابند ہیں، لیکن معاشرت ان کی بھی خراب ہے، دین کے مطابق نہیں ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کا دین ناقص ہے۔"

اس لیے معاشرت کے بارے میں جو احکام اور تعلیمات اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عطا فرمائی ہیں ان کو جاننا، ان کی اہمیت پہچاننا اور ان پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اُن پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر ہر چیز سکھا گئے

معاشرت کے بارے میں علامہ نووی رحمہ اللہ نے پہلا باب "کھانے پینے کے آداب" سے شروع فرمایا ہے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس طرح زندگی کے ہر شعبے سے متعلق بڑی اہم تعلیمات عطا فرمائی ہیں، اسی طرح کھانے پینے کے بارے میں بھی اہم تعلیمات عطا فرمائی ہیں۔ ایک مرتبہ ایک مشرک نے اسلام پر اعتراض کرتے ہوئے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ

> تمہارے نبی تمہیں ہر چیز سکھاتے ہیں، حتیٰ کہ قضائے حاجت کا طریقہ بھی سکھاتے ہیں؟

اس کا مقصد اعتراض کرنا تھا کہ بھلا قضاء حاجت کا طریقہ بھی کوئی سکھانے کی چیز ہے۔ یہ تو کوئی ایسی اہم بات نہیں تھی کہ ایک نبی اور پیغمبر جیسا جلیل القدر اور عظیم الشان انسان اس کے بارے میں کچھ کہے۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے جواب میں فرمایا کہ جس چیز کو تم اعتراض کے طور پر بیان کر رہے ہو، وہ ہمارے لیے فخر کی بات ہے، یعنی ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ہر چیز سکھائی ہے، یہاں تک کہ ہمیں یہ بھی سکھایا کہ جب ہم قضاءِ حاجت کے لیے جائیں تو قبلہ رخ نہ بیٹھیں اور نہ داہنے ہاتھ سے استنجاء کریں[1]۔ جیسے ماں باپ اپنی اولاد کو سب کو کچھ سکھاتے ہیں۔ اس لیے کہ اگر ماں باپ اس بات سے شرمانے لگیں کہ اپنی اولاد کو پیشاب پاخانے کے کیا طریقے بتائیں؟ تو اس صورت میں اولاد کو کبھی پیشاب پاخانے کا صحیح طریقہ نہیں آئے گا۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہم پر اور آپ سب پر ماں باپ سے کہیں زیادہ شفیق اور مہربان ہیں۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ہر چیز کے طریقے سکھائے۔ ان میں کھانے کا طریقہ بھی ہے اور کھانے کے بارے میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ایسے آداب بیان فرمائے جن کے ذریعے کھانا عبادت بن جائے اور باعثِ اجر و ثواب بن جائے۔

کھانے کے تین آداب

چنانچہ یہ حدیث جو میں نے ابھی پڑھی ہے اس میں حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ کھانے کے وقت اللہ کا نام لو۔ یعنی ''بسم اللہ'' پڑھ کر کھانا شروع کرو اور اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور برتن کے اس حصے سے کھاؤ جو تم سے قریب تر ہے، آگے بڑھ کر دوسری جگہ سے مت کھاؤ۔ اس حدیث میں تین آداب بیان فرمادیے۔

(۱) صحیح مسلم ۲۲۳/۱ (۳۶۲)۔

پہلا ادب ''بسم اللہ'' پڑھنا

ایک اور حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی کھانا شروع کرے تو اللہ کا نام لے اور اگر کوئی شخص شروع میں ''بسم اللہ'' پڑھنا بھول گیا تو اس کو چاہیے کہ کھانا کھانے کے دوران جب بھی ''بسم اللہ'' پڑھنا یاد آئے اس وقت یہ الفاظ کہہ دے:

بِسْمِ اللہِ اَوَّلَہٗ و آخِرَہٗ[1]

اللہ کے نام کے ساتھ شروع کرتا ہوں، اول میں بھی اللہ کا نام اور آخر میں بھی اللہ کا نام۔

شیطان کے قیام وطعام کا انتظام مت کرو

ایک حدیث میں سیدنا حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جب کوئی شخص اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت اللہ کا نام لیتا ہے اور کھانے کے وقت بھی اللہ کا نام لیتا ہے تو شیطان اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے کہ اس گھر میں نہ تو تمہارے لیے رات کو رہنے کی کوئی گنجائش ہے اور نہ ہی کھانے کے لیے کوئی گنجائش ہے، اس لیے کہ اس شخص نے گھر میں داخل

---

(۱) سنن ابی داود ۳/۳۴۷ (۳۷۶۷) المکتبۃ العصریۃ بیروت، وسنن الترمذی ۳/۴۳۴ (۱۸۵۸) وقال ھذا حدیث حسن صحیح (طبع دار الغرب الإسلامی)۔

ہوتے وقت بھی اللہ کا نام لے لیا اور کھانا کھاتے وقت بھی اللہ کا نام لے لیا، اس لیے نہ تو یہاں قیام کا انتظام ہے اور نہ طعام کا انتظام ہے اور اگر کسی شخص نے گھر داخل ہوتے وقت اللہ کا نام نہیں لیا اور ویسے ہی گھر میں داخل ہوگیا تو شیطان اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے کہ لو بھائی! تمہارے قیام کا انتظام بھی ہوگیا، تم یہاں رات گزار سکتے ہو۔ کیونکہ یہاں پر اللہ کا نام نہیں لیا گیا اور جب وہ شخص کھانا کھاتے وقت بھی اللہ کا نام نہیں لیتا تو اس وقت شیطان اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے کہ تمہارے طعام کا بھی انتظام ہوگیا"۔ (۱)

گھر میں داخل ہونے کی دعا

اس حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے دو باتوں کی تاکید فرمائی ہے۔ ایک یہ کہ جب آدمی گھر میں داخل ہو تو اللہ کا نام لے کر داخل ہو اور بہتر یہ ہے کہ وہ دعا پڑھے جو حضورِ اقدس ﷺ سے منقول ہے وہ یہ ہے کہ

"اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ خَیْرَ الْمَوْلَجِ وَخَیْرَ الْمَخْرَجِ بِسْمِ اللّٰہِ وَلَجْنَا وَبِسْمِ اللّٰہِ خَرَجْنَا وَعَلَی اللّٰہِ رَبِّنَا تَوَکَّلْنَا"۔(۲)

---

(۱) صحیح مسلم ۱۵۹۸/۳ (۲۰۱۸) وسنن ابی داود ۳۴۶/۳ (۳۷۶۵)۔

(۲) سنن ابی داود ۳۲۵/٤ (٥٠٩٦) والحديث سكت عنه أبوداود، وقال المنذري في "مختصره" ٤٦٠/٤ (٤٩٣٣): في إسناده محمد بن إسماعيل بن عياش وأبوه، وفيهما مقال. (طبع دار الكتب العلمية) والدعوات الكبير للبيهقي ٧١/٢ (٤٨٠) طبع غراس للنشر الكويت۔ والمعجم الكبير للطبراني ۲۹۶/۳ (٣٤٥٢) طبع مكتبة ابن تيمية القاهرة۔

اے اللہ میں آپ سے بہترین داخلہ مانگتا ہوں کہ میرا داخلہ خیر کے ساتھ ہو اور جب گھر سے نکلوں تو بھی خیر کے ساتھ نکلوں۔

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب گھر میں داخل ہوتے تو یہ دعا پڑھتے تھے۔ اس لیے کہ جب آدمی گھر میں داخل ہوتا ہے تو اسے کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ میرے پیچھے گھر میں کیا ہوگا، ہوسکتا ہے کہ گھر میں داخل ہونے کے بعد تکلیف کی خبر ملے یا رنج اور صدمے اور پریشانی کی خبر ملے، چاہے وہ دنیوی پریشانی کی خبر ہو یا دینی پریشانی کی خبر ہو۔ اس لیے کہ گھر میں داخل ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرلو کہ یا اللہ! میں گھر میں داخل ہورہا ہوں، اندر جا کر میں اپنے گھر کو اور گھر والوں کو اچھی حالت میں پاؤں اور اس کے بعد پھر ضرورت سے دوبارہ گھر سے نکلنا تو ہوگا، لیکن وہ نکلنا بھی خیر کے ساتھ ہو، کسی پریشانی یا دکھ اور تکلیف کی وجہ سے گھر سے نہ نکلنا پڑے: مثلاً گھر میں داخل ہونے کے بعد پتہ چلا کہ گھر والے بیمار ہیں، اب ان کے علاج اور دوا کے لیے گھر سے باہر نکلنا پڑا یا گھر میں کوئی پریشانی آگئی اور اب اس پریشانی کے مداوا کے لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا تلقین فرمادی کہ گھر میں داخل ہوتے وقت یہ دعا پڑھ کرلیا کرو۔

دعا پڑھنا یاد نہ آئے تو اپنے گھر کے دروازے پر لکھ کر لگالو، تاکہ اس کو دیکھ کر یاد آجائے اس لیے یہ دعا دنیاوی پریشانیوں سے بچانے کا سبب ہے اور آخرت کا ثواب اور فضیلت الگ حاصل ہوگی۔ لہٰذا جب انسان یہ دعا پڑھتے ہوئے داخل ہوا کہ میرا داخل ہونا بھی خیر کے ساتھ ہو اور میرا نکلنا بھی خیر کے

ساتھ ہو تو پھر بتایئے کہ شیطان کی اس گھر میں قیام کرنے کی گنجائش کہاں باقی رہے گی؟ اس لیے شیطان کہتا ہے کہ اس گھر میں میرے لیے قیام کا انتظام نہیں۔

بڑا پہلے کھانا شروع کرے

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی کھانے میں شریک ہوتے تو ہمارا یہ معمول تھا کہ جب تک حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کھانا شروع نہ فرماتے، اس وقت تک ہم لوگ کھانے کی طرف ہاتھ نہ بڑھاتے تھے، بلکہ اس کا انتظار کرتے تھے کہ جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کھانے کی طرف ہاتھ بڑھائیں۔ اس وقت ہم کھانا شروع کریں (۱)۔

اس حدیث سے فقہاءِ کرام نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ جب کوئی چھوٹا کسی بڑے کے ساتھ کھانا کھارہا ہو تو ادب کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ چھوٹا خود پہلے شروع نہ کریں، بلکہ بڑے کے شروع کرنے کا انتظار کرے۔

شیطان کھانا حلال کرنا چاہتا تھا

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ کھانے کے وقت ہم حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حاضر تھے، اتنے میں ایک نوعمر بچی بھاگتی ہوئی آئی اور ایسا معلوم ہورہا تھا کہ وہ بھوک سے بے تاب ہے اور ابھی تک کسی نے کھانا شروع نہیں کیا تھا، اس لیے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اب تک کھانا شروع نہیں

(۱) صحیح مسلم ۱۵۹۷/۳ (۲۰۱۷)۔

فرمایا تھا، مگر اس بچی نے آکر جلدی سے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھادیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کو کھانا کھانے سے روک دیا، پھر تھوڑی دیر بعد ایک دیہاتی آیا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بھی بھوک سے بہت بے تاب ہے اور کھانے کی طرف لپک رہا ہے، اس نے بھی آکر کھانے کی طرف ہاتھ بڑھانے کا ارادہ کیا تو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا بھی ہاتھ پکڑ لیا اور اس کو بھی کھانے سے روک دیا۔ اس کے بعد پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ

"اِنَّ الشَّیطَانَ یَستَحِلُّ الطَّعَامَ اَنْ لَا یُذْکَرَ اسمُ اللّٰہِ تَعَالٰی عَلَیہِ وَاِنَّہٗ جَاءَ بِھٰذِہِ الجارِیَۃِ لِیَستَحِلَّ بِھَا فَاَخَذْتُ بِیَدِھَا، فَجَاءَ بِھٰذَا الْاَعْرَابِیِّ لِیَستَحِلَّ بِہٖ، فَاَخَذْتُ بِیَدِہٖ، وَالَّذِیْ نَفْسِی بِیَدِہٖ، اِنَّ یَدَہٗ فِیْ یَدِیْ مَعَ یَدِھَا۔"(۱)

شیطان اس کھانے کو اس طرح اپنے لیے حلال کرنا چاہتا تھا کہ اس کھانے پر اللہ کا نام نہ لیا جائے، چنانچہ اس نے لڑکی کے ذریعے کھانا حلال کرنا چاہا، مگر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے بعد اس نے اس دیہاتی کے ذریعے کھانا حلال کرنا چاہا۔ مگر میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اللہ کی قسم! شیطان کا ہاتھ اس لڑکی کے ہاتھ کے ساتھ میرے ہاتھ میں ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم ۱۵۹۷/۳ (۲۰۱۷)۔

بچوں کی نگہداشت کریں

اس حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے اس طرف اشارہ فرما دیا کہ بڑے کا کام یہ ہے کہ اگر چھوٹا اس کی موجودگی میں اللہ کا نام لیے بغیر کھانا شروع کر رہا ہے تو بڑے کو چاہیے کہ وہ اس کو متنبہ کرے اور ضرورت ہو تو اس کا ہاتھ پکڑ لے اور اس سے کہے کہ پہلے ''بسم اللہ'' کہو، پھر کھاؤ۔

آج ہم لوگ بھی اپنے اہل وعیال کے ساتھ کھانے پر بیٹھتے ہیں، لیکن اس بات کا خیال نہیں ہوتا کہ اولاد اسلامی آداب کا لحاظ کر رہی ہے یا نہیں؟ اس لیے حضورِ اقدس ﷺ نے اس حدیث میں اس بات کی تعلیم دے دی کہ بڑے کا فرض ہے کہ وہ بچوں کی طرف نگاہ رکھے اور ان کو ٹوکتا رہے اور ان کو اسلامی آداب سکھائے، ورنہ کھانے کی برکت دور ہو جائے گی۔

شیطان نے قے کر دی

حضرت امیہ بن مخشی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ تشریف فرما تھے۔ آپ ﷺ کے سامنے ایک شخص کھانا کھا رہا تھا، اس نے بسم اللہ کے بغیر کھانا شروع کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ سارا کھانا کھالیا۔ صرف ایک لقمہ باقی رہ گیا، جب وہ شخص اس آخری لقمے کو منہ کی طرف لے جانے لگا تو اس وقت یاد آیا کہ میں نے کھانا شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ نہیں پڑھی تھی، جب کہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ جب آدمی کھانا کھاتے وقت بسم اللہ پڑھنا بھول جائے تو کھانے کے دوران جب اس کو بسم اللہ پڑھنا یاد آجائے تو اس وقت وہ ''بسم اللہ اولہ وآخرہ'' پڑھ لے، جب اس شخص نے یہ دعا پڑھی تو

حضورِ اقدس ﷺ اس کو دیکھ کر ہنسنے لگے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس وقت یہ کھانا کھا رہا تھا تو شیطان بھی اس کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا۔ لیکن جب اس نے اللہ کا نام لیا اور "بِسْمِ اللّٰہِ اَوَّلَہٗ وَآخِرَہٗ" پڑھ لیا تو شیطان نے جو کچھ کھایا تھا، اس کی قے کر دی اور اس کھانے میں اس کا جو حصہ تھا اس ایک چھوٹے سے جملے کی وجہ سے وہ ختم ہو گیا اور آنحضرت ﷺ نے اس منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر تبسم فرمایا اور آپ ﷺ نے اس بات کی طرف اشارہ فرما دیا کہ اگر آدمی کھانا شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ پڑھنا بھول گیا تو جب یاد آجائے۔ اس وقت "بِسْمِ اللّٰہِ اَوَّلَہٗ وَآخِرَہٗ" پڑھ لے، اس کی وجہ سے کھانے کی بے برکتی زائل ہو جائے گی۔(۱)

یہ کھانا اللہ کی عطا ہے

ان احادیث سے یہ معلوم ہوا کہ کھانا شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھ لینا چاہیے اور کہنے کو تو یہ معمولی بات ہے کہ "بسم اللہ الرحمن الرحیم" پڑھ کر کھانا شروع کر دیا، لیکن اگر غور کرو گے تو معلوم ہو گا کہ یہ اتنی عظیم الشان عبادت ہے کہ اس کی وجہ سے ایک طرف تو یہ کھانا کھانا عبادت اور باعثِ ثواب بن جاتا ہے اور دوسری طرف اگر آدمی ذرا دھیان سے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کہہ لے تو اس کی وجہ سے اللہ ﷻ کی معرفت کا بہت بڑا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ "بسم اللہ الرحمن الرحیم"

(۱) مسند أحمد ۲۹۶/۳۱ (۱۸۹۶۳) طبع الرسالة، وسنن أبي داود ۳۴۷/۳ (۳۷۶۸) والمستدرك للحاكم ۱۲۱/٤ (۷۰۸۹) وقال هذا حديث صحيح الإسناد ولم يخرجاه ووافقه الذهبي في "التلخيص".

پڑھنا حقیقت میں انسان کو اس طرف متوجہ کر رہا ہے کہ جو کھانا میرے سامنے اس وقت موجود ہے یہ میری قوتِ بازو کا کرشمہ نہیں ہے، بلکہ کسی دینے والے کی عطا ہے۔ میرے بس میں یہ بات نہیں تھی کہ میں یہ کھانا مہیا کرلیتا اور اس کے ذریعے اپنی ضرورت پوری کرلیتا۔ اپنی بھوک مٹا دیتا، یہ محض اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اور اس کا کرم ہے کہ اس نے مجھے یہ کھانا عطا فرما دیا۔

یہ کھانا تم تک کس طرح پہنچا؟

اور درحقیقت یہ ''بسم اللہ'' کا پڑھنا اس طرف توجہ دلاتا ہے کہ ذرا غور تو کرو کہ یہ ایک نوالہ جو تم نے منہ میں رکھا اور ایک سیکنڈ میں تم نے حلق سے نیچے اتار لیا، اس ایک نوالے کو تمہارے منہ تک پہنچانے کے لیے کائنات کی کتنی قوتیں صرف ہوئیں۔ ذرا سوچو تو سہی کہ روٹی کا ایک ٹکڑا کس طرح تم تک پہنچا؟ کہاں کس کاشت کار نے بیج بونے سے پہلے زمین کو نرم اور ہموار کرنے کے لیے کتنی مدت تک بیلوں کے ذریعے ہل چلایا؟ اور پھر اس زمین کے اندر بیج ڈالا اور پھر اس کو پانی دیا، پھر اس کے اوپر مسلسل ہوائیں چلیں، سورج نے اس کے اوپر روشنی کی کرنیں ڈالیں اور پھر اللہ تعالیٰ نے بادل بھیج کر بارشیں برسائیں۔ اس کے بعد جا کر باریک اور کمزور سی ایک کونپل نمودار ہوئی اور وہ کونپل اتنی کمزور کہ اگر ایک چھوٹا سا بچہ بھی اس کو اپنے ہاتھ سے دبا دے تو وہ مسل جائے، لیکن زمین جیسی سخت چیز کا پیٹ پھاڑ کر اس میں شگاف ڈال کر نمودار ہو رہی ہے، پھر اس کونپل سے پودا بنا اور پودے سے درخت بنا اور پھر اس کے اوپر خوشے نمودار ہوئے اور پھر اس پر غلے کے دانے پیدا ہوئے، پھر کتنے انسان اس کے توڑنے میں شریک ہوئے اور کتنے جانوروں نے اس کو روند کر اس کا بھوسہ الگ اور دانہ

الگ کیا، پھر وہاں سے کتنے شہروں میں ہوتا ہوا تمہارے شہر میں پہنچا اور کتنے انسان اس کی خرید و فروخت میں شریک ہوئے پھر کس نے اس گندم کو چکی میں پیس کر آٹا بنایا اور پھر تم اس کو خرید کر اپنے گھر لائے اور کس نے اس آٹا کو گوندکر روٹی پکائی؟ اور جب وہ روٹی تمہارے سامنے آئی تو تم نے ایک لمحے کے اندر منہ میں ڈال کر حلق سے نیچے اتار دیا۔

اب ذرا سوچو، کیا یہ تمہاری قدرت میں تھا کہ تم کائنات کی ان ساری قوتوں کو جمع کر کے روٹی کے ایک نوالے کو تیار کر کے حلق سے نیچے اتار لیتے؟ کیا آسمان سے بارش برسانا تمہاری قدرت میں تھا؟ کیا سورج کی کرنوں کو پہنچانا تمہاری قدرت میں تھا؟ کیا تمہاری قدرت میں یہ تھا کہ تم اس کمزور کونپل کو زمین سے نکالتے؟ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ﴿٦٣﴾ ءَ اَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ﴿٦٤﴾ [1]

ذرا غور کرو کہ تم جو چیز زمین میں ڈالتے ہو۔ کیا تم اس کے اگانے والے ہو یا ہم اس کو اگاتے ہیں؟

تم اس کے لیے کتنے پیسے بھی خرچ کر لیتے، کتنے ہی وسائل جمع کر لیتے، مگر پھر بھی یہ کام تمہارے بس میں نہیں تھا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اور اس دھیان اور استحضار کے ساتھ کھاؤ گے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اور ان کا کرم ہے کہ انہوں نے مجھے عطا فرمایا، تو وہ سارا کھانا تمہارے لیے عبادت بن جائے گا۔

---

(۱) سورۃ الواقعۃ آیت (٦٣ و ٦٤)۔

مسلمان اور کافر کے کھانے میں امتیاز

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبد الحیٔ عارفی رحمہ اللہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ فرمایا کرتے تھے کہ دین درحقیقت زاویۂ نگاہ کی تبدیلی کا نام ہے۔ ذرا سا زاویۂ نگاہ بدل لو تو یہی دنیا دین بن جائے گی۔ مثلاً یہی کھانا "بسم اللہ" پڑھے بغیر کھالو اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کے استحضار کے بغیر کھالو۔ تو پھر اس کھانے کی حد تک تم میں اور کافر میں فرق نہیں۔ اس لیے کھانا کافر بھی کھا رہا ہے اور تم بھی کھا رہے ہو؟ اس کھانے کے ذریعے سے تمہاری بھوک دور ہوجائے گی اور زبان کو چٹخارہ مل جائے گا، لیکن وہ کھانا تمہاری دنیا ہے، دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اور جیسے گائے، بھینس اور بکری اور دوسرے جانور کھا رہے ہیں اسی طرح تم بھی کھا رہے ہو، دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

زیادہ کھانا کمال نہیں

دارالعلوم دیو بند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ کا ایک بڑا حکیمانہ واقعہ ہے۔ ان کے زمانے میں آریہ سماج ہندوؤں نے اسلام کے خلاف بڑا شور مچایا ہوا تھا۔ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ ان آریہ سماج والوں سے مناظرہ کیا کرتے تھے تاکہ لوگوں پر حقیقتِ حال واضح ہوجائے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ ایک مناظرے کے لیے تشریف لے گئے۔ وہاں ایک آریہ سماج کے پنڈت سے مناظرہ تھا اور مناظرے سے پہلے کھانے کا انتظام تھا، حضرت نانوتوی رحمہ اللہ بہت تھوڑا کھانے کے عادی تھے، جب کھانا کھانے بیٹھے تو حضرت والا چند نوالے کھا کر اٹھ گئے اور جو آریہ سماج کے عالم تھے، وہ کھانے کے استاد

تھے، انہوں نے خوب ڈٹ کر کھایا، جب کھانے سے فراغت ہوئی تو میزبان نے حضرت نانوتوی رحمہ اللہ سے کہا: حضرت آپ نے تو بہت تھوڑا سا کھانا کھایا۔ حضرت رحمہ اللہ نے فرمایا کہ مجھے جتنی خواہش تھی اتنا کھالیا۔ وہ آریا سماج بھی قریب بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے حضرت رحمہ اللہ سے کہا کہ مولانا آپ کھانے کے مقابلے تو ابھی سے ہار گئے اور یہ آپ کے لیے بد فالی ہے کہ جب آپ کھانے پر ہار گئے تو اب دلائل کا مقابلہ ہے تو اس میں آپ ہار جائیں گے۔ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے جواب دیا کہ بھائی اگر کھانے کے اندر مناظرہ اور مقابلہ کرنا تھا تو مجھ سے کرنے کی کیا ضرورت تھی، کسی بھینس یا بیل سے کرلیا ہوتا، اگر اس سے مناظرہ کریں گے تو آپ یقیناً بھینس سے بھی ہار جائیں گے۔ میں تو دلائل میں مناظرہ کرنے آیا تھا، کھانے میں مناظرہ اور مقابلہ کرنے تو نہیں آیا تھا۔

جانور اور انسان میں فرق

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ نے اس جواب میں اس طرف اشارہ فرمادیا کہ اگر غور سے دیکھو تو کھانے پینے کے اندر انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں۔ جانور بھی کھاتا اور انسان بھی کھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر جانور کو رزق دیتا ہے اور بسا اوقات ان کو تم سے اچھا رزق دیتا ہے، لیکن ان کے درمیان اور تمہارے درمیان فرق یہ ہے کہ تم کھانا کھاتے وقت اپنے کھلانے والے کو فراموش نہ کرو، بس جانور اور انسان میں یہی فرق ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کی مخلوق کو دعوت

واقعہ لکھا ہے جب اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو ساری دنیا پر

حکومت عطا فرمادی تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی: ''یا اللہ! جب آپ نے مجھے ساری دنیا پر حکومت عطا فرمادی تو میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کی ساری مخلوق کی ایک سال تک دعوت کروں''۔ اللہ نے فرمایا کہ ''یہ کام تمہاری قدرت اور بس میں نہیں۔'' انہوں نے پھر درخواست کی: ''یا اللہ! ایک ماہ کی دعوت کی اجازت دے دیں۔'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ'' تم اس کی بھی قدرت نہیں رکھتے۔'' پھر انہوں نے درخواست کی کہ ''یا اللہ! ایک دن کی اجازت دے دیجیے،'' تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''تم اس کی بھی قدرت نہیں رکھتے، لیکن اگر تمہارا اصرار ہے تو چلو ہم تمہیں اس کی اجازت دے دیتے ہیں۔''

جب اجازت مل گئی تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے تمام جنات اور انسانوں کو اجناس اور غذائیں جمع کرنے کا حکم دیا اور کھانا پکنا شروع ہوا اور کئی مہینوں تک کھانا تیار ہوتا رہا اور پھر سمندر کے کنارے ایک بہت لمبا چوڑا دسترخوان بچھایا گیا اور اس پر کھانا چنا گیا اور ہوا کو حکم دیا کہ وہ اس پر چلتی رہے تا کہ کھانا خراب نہ ہوجائے۔ اس کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کی یااللہ! کھانا تیار ہوگیا ہے۔ آپ اپنی مخلوق میں سے کسی کو بھیج دیں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم پہلے سمندری مخلوق میں سے ایک مچھلی کو تمہاری دعوت کھانے کے لیے بھیج دیتے ہیں۔

چنانچہ ایک مچھلی سمندر سے نکلی اور کہا کہ اے سلیمان! معلوم ہوا ہے کہ آج تمہاری طرف سے دعوت ہے؟ انہوں نے فرمایا ہاں تشریف لائیں، کھانا تناول کریں چنانچہ اس مچھلی نے دسترخوان کے ایک کنارے سے کھانا شروع کیا اور دوسرے کنارے تک سارا کھانا ختم کر گئی، پھر حضرت سلیمان علیہ السلام سے کہا کہ اور لائیں، حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ تم تو سارا کھانا کھا گئی۔ مچھلی نے کہا کہ کیا

میزبان کی طرف سے مہمان کو یہی جواب دیا جاتا ہے۔ جب سے میں پیدا ہوئی ہوں، اس وقت سے لے کر آج تک ہمیشہ پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہے، لیکن آج تمہاری دعوت کی وجہ سے بھوکی رہی ہوں اور جتنا کھانا تم نے تیار کیا تھا اللہ تعالیٰ مجھے اتنا کھانا دن میں دو مرتبہ کھلاتے ہیں، مگر آج پیٹ بھر کے کھانا نہیں ملا۔ بس، حضرت سلیمان علیہ السلام فوراً سجدے میں گر گئے اور استغفار کیا۔ (۱)

کھانا کھا کر اللہ کا شکر ادا کرو

بہر حال! اللہ تعالیٰ ہر ایک مخلوق کو رزق دے رہے ہیں، سمندر کی تہہ میں اور اس کی تاریکیوں میں، رزق عطا فرما رہے ہیں۔ قرآنِ کریم میں ہے کہ

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (۲)

کوئی جاندار زمین پر چلنے والا ایسا نہیں ہے کہ اس کی روزی اللہ کے ذمے نہ ہو۔

لہٰذا کھانے کی حد تک تمہارے اور جانوروں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اس کو بھی مل رہی ہیں۔ جانوروں کو چھوڑیے، اللہ تعالیٰ تو اپنے ان دشمنوں کو بھی رزق دے رہا ہے جو اللہ کے وجود کا انکار کر رہے ہیں، خدا کا مذاق اڑا رہے ہیں، خدا کی توہین کر رہے ہیں، جو اس کے بھیجے ہوئے دین کا مذاق اڑا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو بھی رزق دے رہا ہے، لہٰذا کھانے کے اعتبار

(۱) شرح أسماء الله الحسنى للقشيري ص ١٤٦، طبع دار آزال بيروت وحياة الحيوان للدميري ١/٣٨٠۔ طبع دار الكتب العلمية۔
(۲) سورۃ ھود آیت (٦)۔

سے تم میں اور ان میں کیا فرق ہے؟ وہ فرق یہ ہے کہ جانور اور کافر اور مشرک صرف زبان کے چٹخارے اور پیٹ کی آگ بجھانے کی خاطر کھاتا ہے، اس لیے وہ کھانا کھاتے وقت اللہ کا نام نہیں لیتا، اللہ کا ذکر نہیں کرتا۔ تم مسلمان ہو، تم ذرا سا خیال اور دھیان کر کے، اس کھانے کو اللہ کی عطا سمجھ کر، اس کا نام لے کر کھاؤ اور پھر شکر ادا کرو تو یہی کھانا دین بن جائے گا۔

ہر کام کے وقت زاویۂ نگاہ بدل لو

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے سالہا سال اس بات کی مشق کی ہے۔ مثلاً میں گھر میں داخل ہوا اور کھانے کا وقت آیا اور دسترخوان پر بیٹھے، کھانا سامنے آیا، اب بھوک شدید ہے اور کھانا بھی لذیذ ہے، دل چاہ رہا ہے کہ فوراً کھانا شروع کردوں، لیکن ایک لمحے کے لیے کھانے سے رک گیا اور دل سے کہا کہ یہ کھانا نہیں کھائیں گے۔ اس کے بعد دوسرے لمحے یہ سوچا کہ یہ کھانا اللہ کی عطا ہے اور جو اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمایا ہے، یہ میرے قوتِ بازو کا کرشمہ نہیں ہے اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جب کھانا سامنے آتا تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر کے اس کو کھالیا کرتے تھے[1]۔ اس لیے میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں اس کھانے کو کھاؤں گا۔ اس کے بعد بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کرتا ہوں۔

گھر میں داخل ہوئے اور بچہ کھیلتا ہوا اچھا معلوم ہوا۔ دل چاہا کہ اس کو گود

(۱) ملاحظہ ہو سنن ابی داود ۳/۳۶٦ (۳۸۵۰) وسنن الترمذی ۵/٤٥۱ (۳٤۵۷) وسنن ابن ماجہ ۵/۲٤ (۳۲۸۳)۔

میں اٹھا کر پیار کریں، لیکن ایک لمحے کے لیے رک گئے اور سوچا کہ محض دل چاہنے پر بچے کو گود میں نہیں لیں گے، پھر دوسرے لمحے یہ خیال لائے کہ حدیث شریف میں ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بچوں سے محبت فرمایا کرتے تھے[1] اور ان کو گود میں لے لیا کرتے تھے۔ اب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کی اتباع میں بچے کو گود میں اٹھاؤں گا۔ اس کے بعد بچے کو اٹھالیا۔ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے سالہا سال تک اس عمل کی مشق کی ہے اور پھر یہ شعر سنایا کرتے تھے کہ

جگر پانی کیا ہے مدتوں غم کی کشاکش میں
کوئی آسان ہے کیا خوگرِ آزار ہوجانا

سالہا سال کی مشق کے بعد یہ چیز حاصل ہوئی ہے اور الحمد للہ! تخلف نہیں ہوتا۔ اب جب بھی اس قسم کی کوئی نعمت سامنے آتی ہے تو پہلے ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہ اللہ کی عطا ہے اور پھر اس پر شکر ادا کر کے بسم اللہ پڑھ کر اس کام کو کرلیتا ہوں اور اب عادت پڑگئی ہے اور اسی کو زاویۂ نگاہ کی تبدیلی کہتے ہیں، اس کے نتیجے میں دنیا کی چیز دین بن جاتی ہے۔

کھانا ایک نعمت

ایک مرتبہ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کے ساتھ ایک دعوت میں گئے۔ جب دسترخوان پر کھانا آیا اور کھانا شروع کیا گیا تو حضرت والا رحمہ اللہ نے فرمایا

(۱) صحیح مسلم ۱۸۰۸/٤ (۲۳۱۸)۔

کہ تم ذرا غور کرو کہ ایک کھانے میں جو تم اس وقت کھا رہے ہو، اس میں اللہ تعالیٰ کی مختلف قسم کی کتنی نعمتیں شامل ہیں، سب سے پہلے تو کھانا مستقل نعمت ہے۔ اس لیے اگر انسان شدید بھوکا ہو اور بھوک کی وجہ سے مر رہا ہو اور کھانے کی کوئی چیز میسر نہ ہو تو اس وقت خواہ کتنا ہی خراب سے خراب کھانا اس کے سامنے لایا جائے، وہ اس کو بھی غنیمت سمجھ کر کھانے کے لیے تیار ہوجائے گا اور اس کو بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت سمجھے گا، اس سے معلوم ہوا کہ کھانا اچھا ہو یا برا ہو، لذیذ ہو یا بے مزہ ہو، وہ کھانا بذاتِ خود ایک نعمت ہے۔ اس لیے وہ بھوک کی تکلیف کو دور کر رہا ہے۔

کھانے کی لذت...... دوسری نعمت

دوسری نعمت یہ ہے کہ یہ کھانا مزے دار بھی ہے، اپنی طبیعت کے مطابق بھی ہے، اب اگر کھانا تو موجود ہوتا، لیکن مزے دار نہ ہوتا اور اپنی طبیعت کے موافق نہ ہوتا تو ایسے کھانے کو کھا کر کسی طرح پیٹ بھر کر بھوک تو مار لیتے، لیکن لذت حاصل نہیں ہوتی۔

عزت سے کھانا ملنا...... تیسری نعمت

تیسری نعمت یہ ہے کہ کھلانے والا عزت سے کھلا رہا ہے۔ اب اگر کھانا بھی میسر ہوتا اور مزیدار بھی ہوتا، لذیذ بھی ہوتا، لیکن کھلانے والا ذلت کے ساتھ کھلاتا اور جیسے کسی نوکر اور غلام کو کھلایا جاتا ہے، اس طرح ذلیل کر کے کھلاتا، تو اس وقت اس کھانے کی ساری لذت دھری رہ جاتی اور سارا مزہ خراب ہوجاتا تو

جیسے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ ؎

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

لہٰذا اگر کوئی شخص ذلیل کر کے کھانا کھلا رہا ہے تو اس کھانے میں کوئی لطف نہیں، وہ کھانا بے حقیقت ہے، الحمد للہ ہمیں یہ تیسری نعمت بھی حاصل ہے کہ کھلانے والا عزت سے کھلا رہا ہے۔

بھوک لگنا...... چوتھی نعمت

چوتھی نعمت یہ ہے کہ بھوک اور کھانے کی خواہش بھی ہے۔ اس لیے کہ اگر کھانا بھی میسر ہوتا اور وہ کھانا لذیذ بھی ہوتا اور کھلانے والا عزت سے بھی کھلاتا، لیکن بھوک نہ ہوتی اور معدہ خراب ہوتا تو اس صورت میں اعلیٰ سے اعلیٰ کھانا بھی بے کار ہے، اس لیے کہ انسان اس کو نہیں کھاسکتا، تو الحمد للہ! کھانا بھی لذیذ ہے، کھلانے والا عزت سے کھلا رہا ہے اور کھانے کی بھوک اور خواہش بھی موجود ہے۔

کھانے کے وقت عافیت...... پانچویں نعمت

پانچویں نعمت یہ ہے کہ عافیت اور اطمینان کے ساتھ کھا رہے ہیں، کوئی پریشانی نہیں ہے، اس لیے کہ اگر کھانا تو لذیذ ہوتا، کھلانے والا عزت سے بھی کھلاتا، بھوک بھی ہوتی، لیکن طبیعت میں کوئی ایسی پریشانی لاحق ہوتی، کوئی فکر طبیعت پر ہوتی یا اس وقت کوئی خطرناک قسم کی خبر مل جاتی، جس سے دل و دماغ

پریشان اور ماؤف ہوجاتا تو ایسی صورت میں بھوک ہوتے ہوئے بھی وہ کھانا انسان کے لیے بیکار ہوجاتا ہے، الحمد للہ! عافیت اور اطمینان حاصل ہے، کوئی ایسی پریشانی نہیں ہے، جس کی وجہ سے کھانا بے لذت، بے مزہ ہوجاتا۔

دوستوں کے ساتھ کھانا......چھٹی نعمت

چھٹی نعمت یہ ہے کہ اپنے احباب اور دوستوں کے ساتھ مل کر کھانا کھارہے ہیں، فرض کریں اگر یہ سب نعمتیں حاصل ہوتیں، لیکن اکیلے بیٹھے کھارہے ہوتے۔ تو وہ لطف حاصل نہ ہوتا۔ اس لیے کہ تنہا کھانے میں اور اپنے دوست واحباب کے ساتھ مل کر کھانے میں جو کیف اور لطف حاصل ہوتا ہے وہ تنہا کھاتے وقت حاصل نہیں ہوسکتا، لہٰذا یہ ایک مستقل نعمت ہے۔ بہرحال! فرمایا کرتے تھے کہ یہ کھانا ایک نعمت ہے، لیکن اس ایک کھانے میں اللہ تعالیٰ کی کتنی نعمتیں شامل ہیں تو کیا پھر بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کروگے؟

یہ کھانا عبادتوں کا مجموعہ ہے

لہٰذا جب یہ کھانا اس استحضار کے ساتھ کھایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اتنی نعمتیں عطا فرمائی ہیں تو پھر ہر نعمت پر اللہ کا شکر ادا کر کے کھاؤ اور جب اس طرح ہر نعمت پر شکر ادا کرتے ہوئے کھاؤ گے تو ایک طرف تو کھانے کے اندر عبادتوں میں اضافہ ہورہا ہے، اس لیے کہ اگر صرف ''بسم اللہ'' پڑھ کر کھانا کھالیتے اور ان نعمتوں کا استحضار نہ کرتے، تو بھی وہ کھانا عبادت بن جاتا، لیکن کئی نعمتوں کا استحضار کرتے ہوئے اور ان پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کھانا کھایا تو یہ کھانا بہت سی عبادتوں کا مجموعہ بن گیا اور اس کے نتیجے میں یہ کھانا جو حقیقت میں دنیا

ہے۔ ایک طرف اس کے ذریعے لذت بھی حاصل ہورہی ہے اور دوسری طرف تمہاری نیکیوں میں بھی اضافہ کا سبب بن رہا ہے۔ بس اسی کا نام ''زاویۂ نگاہ کی تبدیلی'' ہے۔ اس زاویۂ نگاہ کی تبدیلی سے انسان کی دنیا بھی دین بن جاتی ہے۔

مولانا شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ؂

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری[1]

اللہ تعالیٰ نے یہ بادل، یہ ہوا، یہ چاند، یہ سورج اور یہ آسمان، ان سب کو تمہاری خدمت کے لیے لگایا ہوا ہے۔ تاکہ ایک روٹی تمہیں حاصل ہوجائے، مگر اس روٹی کو غفلت کے ساتھ مت کھانا، بس تمہارا کام صرف اتنا ہی ہے، بلکہ اللہ کا نام لے کر، اللہ کا ذکر کرکے کھاؤ اور اگر کھانے سے پہلے بھول جاؤ تو جب یاد آجائے، اس وقت ''بِسمِ اللهِ اَوّلَه وَ آخِرَهٗ'' پڑھ لو۔

نفل کام کی تلافی

ہمارے ڈاکٹر عبدالحئی صاحب رحمہ اللہ نے اس حدیث کی بنیاد پر، جس میں دعا بھول جانے کا ذکر ہے، فرمایا کہ جب بھی آدمی کوئی نفلی عبادت اپنے وقت پر ادا کرنا بھول گیا یا کسی عذر کی وجہ سے وہ نفلی عبادت نہ کرسکا، تو یہ نہ سمجھے کہ بس اب اس نفلی عبادت کا وقت تو چلا گیا، اب چھٹی ہوگئی، بلکہ بعد میں حسب معمول موقع مل جائے، اس نفلی عبادت کو کرلے، چنانچہ ایک مرتبہ ہم لوگ

(۱) گلستان سعدی ص ۷ طبع مکتبہ رحمانیہ۔

حضرت والا رحمہ اللہ کے ساتھ ایک اجتماع میں شرکت کے لیے جارہے تھے، مغرب کے وقت وہاں پہنچنا تھا، مگر ہمیں نکلتے ہوئے دیر ہوگئی، جس کی وجہ سے مغرب کی نماز راستے میں ہی ایک مسجد میں پڑھی، چونکہ خیال یہ تھا کہ وہاں پر لوگ منتظر ہوں گے۔ اس لیے حضرت والا نے صرف تین فرض اور دو سنتیں پڑھیں۔

اور ہم نے بھی تین فرض اور دو سنتیں پڑھ لیں اور وہاں سے جلد روانہ ہوگئے، تاکہ جو لوگ انتظار کر رہے ہیں، اُن کو انتظار زیادہ نہ کرنا پڑے، چنانچہ تھوڑی دیر بعد وہاں پہنچ گئے، اجتماع ہوا، پھر عشاء کی نماز بھی وہیں پڑھی اور رات کے دس بجے تک اجتماع رہا، پھر جب حضرت والا رحمہ اللہ وہاں سے رخصت ہونے لگے تو ہم لوگوں کو بلا کر پوچھا کہ بھائی، آج مغرب کے بعد کی اوّابین کہاں گئیں؟ ہم نے کہا کہ حضرت! وہ تو آج رہ گئیں۔ چونکہ راستے میں جلدی تھی اس لیے پڑھ نہیں سکے، حضرت والا رحمہ اللہ نے فرمایا کہ رہ گئیں اور بغیر کسی معاوضے کے رہ گئیں! ہم نے کہا کہ حضرت چونکہ لوگ انتظار میں تھے، جلدی پہنچنا تھا، اس عذر کی وجہ سے اوّابین کی نماز رہ گئی۔ حضرت نے فرمایا کہ الحمد للہ! جب میں نے عشاء کی نماز پڑھی، تو عشاء کی نماز کے ساتھ جو نوافل پڑھا کرتا ہوں ان کے علاوہ مزید چھ رکعتیں پڑھ لیں، اب اگرچہ وہ نوافل اوّابین نہ ہوں۔ اس لیے کہ اوّابین کا وقت تو مغرب کے بعد ہے، لیکن یہ سوچا کہ وہ چھ رکعتیں چھوٹ گئی تھیں، کسی طرح ان کی تلافی کرلی جائے۔ الحمد للہ! میں نے تو اب چھ رکعتیں پڑھ کر اوّابین کی تلافی کرلی ہے۔ اب تم جانو، تمہارا کام۔

فرمایا کہ تم مولوی ہو، یہ کہو گے کہ نوافل کی قضا نہیں ہوتی، اس لیے کہ مسئلہ یہ ہے کہ فرائض اور واجبات کی قضا ہوتی ہے، سنّت اور نفل کی قضا نہیں ہوتی،

آپ نے اوّابین کی قضا کیسے قائم کرلی؟ تو بھائی تم نے وہ حدیث پڑھی ہے جس میں حضورِ اقدس سرورِ دو عالم ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر تم کھانے کے شروع میں ''بسم اللہ'' پڑھنا بھول جاؤ، تو جب درمیان میں یاد آجائے تو اس وقت پڑھ لو اور اگر آخر میں یاد آجائے، اس وقت پڑھ لو۔ بات دراصل یہ ہے کہ ایک نفل اور مستحب کام جو ایک نیکی کا کام تھا جس کے ذریعے نامۂ اعمال میں اضافہ ہوسکتا تھا۔ وہ اگر کسی وجہ سے چھوٹ گیا تو اس کو بالکلیہ مت چھوڑو، دوسرے وقت کرلو۔ اب چاہے اس کو ''قضا'' کہو یا نہ کہو، لیکن اس نفل کام کی تلافی ہوجائے۔

یہی باتیں بزرگوں سے سیکھنے کی ہوتی ہیں، اس دن حضرت والا رحمہ اللہ نے ایک عظیم باب کھول دیا۔ ہم لوگ واقعی یہی سمجھتے تھے اور فقہ کے اندر لکھا ہے کہ نوافل کی قضا نہیں ہوتی، لیکن اب معلوم ہوا کہ ٹھیک ہے، قضا تو نہیں ہوسکتی، لیکن تلافی تو ہوسکتی ہے۔ اس لیے کہ اس نفل کے چھوٹنے کی وجہ سے نقصان ہوگیا، نیکیاں تو گئیں، لیکن بعد میں جب اللہ فراغت کی نعمت عطا فرمائے۔ اس وقت اس نفل کو ادا کرلو۔ اللہ تعالیٰ حضرت والا رحمہ اللہ کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔

دسترخوان اٹھاتے وقت کی دعا

''عن أبی أمامة رضی اللہ عنہ أنَّ النبی ﷺ کان إذا رفع مائدته قال: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا طَيِّبًا مُّبَارَكًا فِيْهِ غَيْرَ مَكْفِيٍّ وَّلَا مُوَدَّعٍ وَّلَا مُسْتَغْنٍى عَنْهُ رَبَّنَا۔''(۱)

---

(۱) صحیح البخاری ۸۲/۷ (۵۴۵۸) وسنن ابی داود ۳۶۶/۳ (۳۸۴۹)۔

حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب دسترخوان اٹھتا تو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔

«اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِيْرًا طَيِّبًا مُّبَارَكًا فِيْهِ غَيْرَ مَكْفِيٍّ وَلَا مُوَدَّعٍ وَلَا مُسْتَغْنًى عَنْهُ رَبَّنَا»۔

یہ عجیب وغریب دعا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تلقین فرمائی، اس کی تلقین اس لیے فرمائی کہ انسان کا بھی عجیب مزاج ہے، وہ یہ کہ جب انسان کو کسی چیز کی شدید خواہش اور حاجت ہوتی ہے، اس وقت تو وہ اس کے لیے شدید بیتاب ہوتا ہے، لیکن جب اس چیز کی حاجت پوری ہوجائے اور اس سے دل بھر جائے تو پھر اسی چیز سے اس کو نفرت ہونے لگتی ہے۔ مثلاً جب انسان کو بھوک لگتی ہے تو اس وقت اس کو کھانے کی طرف رغبت اور شوق تھا اور کھانے کی طرف طبیعت مائل ہورہی تھی، لیکن جب پیٹ بھر گیا تو طبیعت اسی سے نفرت کرتی ہے اور بعض اوقات کھانے کے تصور سے متلی آنے لگتی ہے۔

اس لیے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس دعا کے ذریعے یہ تعلیم دی کہ یہ تمہارے دل میں کھانے کی نفرت پیدا ہورہی ہے، اس نفرت کے نتیجے میں کہیں اللہ کے رزق کی ناقدری اور ناشکری نہ ہوجائے، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دعا فرمائی کہ یا اللہ! اس وقت یہ دسترخوان ہم اپنے سامنے سے تو اٹھارہے ہیں، لیکن اس وجہ سے نہیں اٹھارہے ہیں کہ ہمارے دل میں اس کی قدر نہیں، بلکہ اسی کھانے نے ہماری بھوک بھی مٹائی اور اسی کھانے کے ذریعے ہمیں لذت بھی حاصل ہوئی اور نہ اس وجہ سے اٹھارہے ہیں کہ ہم اس سے مستغنی اور بے نیاز ہیں، اے اللہ! ہم اس سے بے نیاز نہیں ہوسکتے، اس لیے کہ دوبارہ ہمیں اس

کی ضرورت و حاجت پیش آئے گی۔ دسترخوان اٹھاتے وقت یہ دعا کرلو، تاکہ اللہ تعالیٰ کے رزق کی ناقدری نہ ہو اور دوسری طرف اس بات کی دعا بھی ہوجائے کہ یا اللہ! ہمیں دوبارہ یہ رزق عطا فرمایئے۔

کھانے کے بعد کی دعا پڑھ کر گناہ معاف کرالیں

عن معاذ بن انس رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: "من أكل طعامًا فقال: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنِیْ هٰذَا وَرَزَقَنِیْهِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنِّیْ وَلَا قُوَّةٍ" غفر له ما تقدم من ذنبه."(۱)

حضرت معاذ بن انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا: جو شخص کھانا کھانے کے بعد اگر یہ الفاظ کہے: "اس اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے یہ کھانا کھلایا اور میری طاقت اور قوت کے بغیر یہ کھانا مجھے عطا فرمایا۔" اس کے یہ کہنے سے اللہ تعالیٰ اس کے تمام پچھلے گناہ معاف فرمادیتے ہیں۔

اب آپ اندازہ لگائیں کہ یہ چھوٹا سا عمل ہے، لیکن اس کا اجر و ثواب یہ ہے کہ تمام پچھلے گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ یہ ان کا کتنا بڑا کرم ہے۔

---

(۱) سنن ابی داود ٤٢/٤ (٤٠٢٣) و سنن الترمذی ٤٥٢/٥ (٣٤٥٨) و قال هذا حديث حسن غريب۔

عمل چھوٹا ثواب عظیم

یہ بات میں پہلے بھی کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ جہاں کہیں احادیث میں آتا ہے کہ فلاں عمل سے گناہ معاف ہوجاتے ہیں، اس سے مراد صغیرہ گناہ ہوتے ہیں اور کبیرہ گناہوں کے بارے میں قاعدہ یہ ہے کہ وہ بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے، اسی طرح حقوق العباد بھی صاحبِ حق کے معاف کیے بغیر معاف نہیں ہوتے، لیکن اللہ تعالیٰ صغیرہ گناہوں کو نیک عمل کے ذریعے بھی معاف فرمادیتے ہیں، لہٰذا اگر کوئی شخص کھانا کھانے کے بعد یہ دعا پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ اس کے تمام صغیرہ گناہ معاف فرمادیتے ہیں اور وہ آدمی صغیرہ گناہوں سے پاک ہوجاتا ہے، یہ اتنا چھوٹا سا عمل ہے، لیکن اس پر ثواب اتنا عظیم ہے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہم سب کو نسخہ کیمیا بتا گئے، اب چاہے اس دعا کو آدمی زور سے پڑھے یا ہلکی آواز سے پڑھے یا دل میں پڑھ لے تو بھی شکر کی نعمت حاصل ہوجاتی ہے اور آدمی اس نعمت کا مستحق ہوجاتا ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان آداب پر ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

کھانے کے اندر عیب مت نکالو

عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: "ما عاب النبي ﷺ طعاماً قط، إن اشتهاهُ أكلهُ وإن كَرِهَهُ تركه"(۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں کہ

(۱) صحيح البخاري ۱۹۰/٤ (۳۵۹۳) وصحيح مسلم ۱٦۳۲/۳ (۲۰٦٤)۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کھانے میں عیب نہیں نکالا اور کسی کھانے کی برائی نہیں کی، اگر اس کے کھانے کی خواہش ہوتی تو کھالیتے اور اگر کھانے کی خواہش نہ ہوتی تو اس کو چھوڑ دیتے۔

یعنی اگر کھانا پسند نہیں ہے تو اس کو نہیں کھایا، مگر اُس کی برائی بیان نہیں کرتے تھے، اس لیے کہ جو کھانا ہے وہ چاہے ہمیں پسند آرہا ہو یا پسند نہ آرہا ہو، لیکن وہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ رزق ہے اور اللہ کے عطا کیے ہوئے رزق کا احترام اور اس کی تعظیم ہمارے ذمے واجب ہے۔

کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

یوں تو اس کائنات میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ نے کسی حکمت اور مصلحت کے بغیر پیدا کی ہو، اس کائنات میں ہر چیز اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت اور مصلحت کے تحت پیدا فرمائی ہے، ہر چیز کا کوئی نہ کوئی عمل اور فائدہ ضرور ہے اقبال مرحوم نے خوب کہا کہ ؎

نہیں ہے چیز کوئی نکمّی زمانے میں
کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں کوئی چیز بُری پیدا نہیں فرمائی، تکوینی اعتبار سے سب اچھی ہیں، ہر ایک کے اندر کوئی نہ کوئی تکوینی مصلحت ضرور ہے، البتہ جب ہمیں کسی چیز کی حکمت اور مصلحت کا پتہ نہیں لگتا تو ہم کہہ دیتے ہیں کہ یہ چیز بری ہے، ورنہ حقیقت میں کوئی چیز بری نہیں۔ حتیٰ کہ وہ مخلوقات جو بظاہر موذی

اور تکلیف دہ معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً سانپ اور بچھو ہیں۔ ان کو ہم اس لیے برا سمجھتے ہیں کہ بعض اوقات یہ ہمیں نقصان پہنچاتے ہیں، لیکن کائنات کے مجموعی انتظام کے لحاظ سے ان میں بھی کوئی نہ کوئی حکمت اور مصلحت ضرور ہے۔ ان میں فائدہ موجود ہے۔ چاہے ہمیں پتہ چلے یا نہ چلے۔

ایک بادشاہ ایک مکھی

ایک بادشاہ کا قصہ لکھا ہے کہ وہ ایک دن اپنے دربار میں بڑی شان و شوکت سے بیٹھا ہوا تھا، ایک مکھی آکر اس کی ناک پر بیٹھ گئی، اس بادشاہ نے اس کو اڑا دیا، وہ پھر آکر بیٹھ گئی، اس نے دوبارہ اڑا دیا، وہ پھر آکر بیٹھ گئی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض مکھیاں بہت لیچڑ قسم کی ہوتی ہیں، ان کو کتنا ہی اڑالو وہ دوبارہ اسی جگہ آکر بیٹھ جاتی ہیں، وہ بھی اسی قسم کی تھی، بادشاہ نے اس وقت کہا کہ خدا جانے یہ مکھی اللہ تعالیٰ نے کیوں پیدا کی؟ یہ تو تکلیف ہی تکلیف پہنچا رہی ہے، اس کا کوئی فائدہ تو نظر نہیں آتا۔ اس وقت دربار میں ایک بزرگ موجود تھے، ان بزرگ نے اس بادشاہ سے کہا کہ اس مکھی کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ تم جیسے جابر اور متکبر انسانوں کے دماغ درست کرنے کے لیے پیدا کی ہے، تم اپنی ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے دکھا دیا کہ تم اتنے عاجز ہو کہ اگر ایک مکھی تمہیں ستانا چاہے تو تمہارے اندر اتنی طاقت نہیں ہے کہ اپنے آپ کو اس کی تکلیف سے بچالو۔ اس کی پیدائش کی یہی حکمت اور مصلحت کیا کم ہے۔ بہر حال! اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کسی نہ کسی مصلحت اور حکمت کے تحت پیدا کی ہے۔

ایک بچھو کا عجیب واقعہ

امام رازی رحمہ اللہ مشہور بزرگ اور علمِ کلام کے ماہر گزرے ہیں۔ جنہوں نے ''تفسیر کبیر'' کے نام سے قرآن کی مشہور تفسیر لکھی ہے۔ اس تفسیر میں صرف سورۂ فاتحہ کی تفسیر دوسو (۲۰۰) صفحات پر مشتمل ہے اور اس تفسیر میں سورۂ فاتحہ کی آیت ''الرحمن الرحیم'' کی تفسیر کے تحت ایک واقعہ لکھا ہے کہ حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن میرے دل میں خیال آیا اور اچانک میں دریائے نیل کے کنارے پہنچ گیا۔ جب میں دریائے نیل کے کنارے کنارے چلنے لگا تو میں نے دیکھا کہ میرے آگے ایک موٹا تازہ بچھو چلا جارہا ہے۔ میرے دل میں خیال آیا کہ آج میں اس بچھو کا تعاقب کرتا ہوں کہ یہ کہاں جاتا ہے؟ چنانچہ وہ بچھو آگے چلتا رہا اور میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا، چلتے چلتے تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ دریا کے کنارے ایک مینڈک کھڑا ہے اور یہ بچھو چھلانگ لگا کر اس کی پُشت پر سوار ہوگیا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے دریا عبور کرنے کے لیے کشتی بھیج دی، چنانچہ وہ مینڈک اس کو اپنی پیٹھ پر سوار کرکے روانہ ہوگیا، چونکہ میں نے یہ طے کرلیا تھا کہ آج میں یہ دیکھوں گا بچھو کہاں جارہا ہے، اس لیے میں نے بھی کشتی لی اور اس کے پیچھے روانہ ہوگیا حتیٰ کہ اس مینڈک نے دریا پار کیا اور جاکر اسی طرح دوسرے کنارے پر جاکر لگ گیا اور وہ بچھو چھلانگ لگا کر اتر گیا۔ اب بچھو آگے چلا اور میں نے اس کا پھر تعاقب کرنا شروع کردیا۔

آگے میں نے دیکھا کہ ایک آدمی ایک درخت کے نیچے سورہا ہے، جب میں اس آدمی کے قریب گیا تو میں نے دیکھا کہ ایک زہریلا سانپ اپنا پھن

اٹھائے اس آدمی کے سر کے پاس کھڑا ہے اور قریب ہے کہ وہ سانپ اس کو ڈس لے، اتنے میں یہ بچھو تیزی کے ساتھ سانپ کے اوپر سوار ہوگیا اور اس پر ڈنک مارا اور سانپ نے اس بچھو کو ڈس لیا اور دونوں مرگئے اور وہ آدمی صحیح سالم رہا[1]۔

بہرحال! دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کے پیدا کرنے میں کوئی نہ تکوینی حکمت اور مصلحت نہ ہو۔

نجاست میں پیدا ہونے والے کیڑے

ایک اور قصہ دیکھا معلوم نہیں کہ صحیح ہے یا نہیں؟ اگر صحیح ہے تو بڑی عبرت کا واقعہ ہے، وہ یہ کہ ایک صاحب ایک دن قضاءِ حاجت کررہے تھے، قضاءِ حاجت میں ان کو سفید سفید کیڑے نظر آئے، جو بعض اوقات پیٹ کے اندر پیدا ہوجاتے ہیں ان صاحب کے دل میں یہ خیال آیا کہ اور جتنی مخلوق ہے ان سب کی پیدائش کی کوئی نہ کوئی حکمت اور مصلحت سمجھ میں آتی ہے، لیکن یہ جاندار مخلوق، جو نجاست میں پیدا ہوجاتی ہے، نجاست کے ساتھ نکلتی ہے اور نجاست کے ساتھ ہی بہا دی جاتی ہے، اس کا کوئی عمل اور فائدہ ہی نظر نہیں آتا، پتہ نہیں اللہ تعالیٰ نے یہ مخلوق کس مصلحت سے پیدا کی ہے؟

کچھ عرصے بعد ان صاحب کی آنکھ میں کچھ تکلیف ہوئی، اب تکلیف کے خاتمے کے لیے سارے علاج کرلیے، مگر کوئی فائدہ نہ ہوا، آخر میں ایک پرانا کوئی طبیب تھا اس کے پاس جاکر بتایا کہ یہ تکلیف ہے، اس کا کیا علاج ہے؟ اس طبیب نے بتایا کہ اس کا کوئی علاج نہیں ہے، البتہ ایک علاج ہے جو کبھی کبھی

---

(۱) تفسیر کبیر ۲۰۱/۱، طبع دار احیاء التراث العربی۔

کار آمد ہو جاتا ہے، وہ یہ کہ انسان کے جسم میں جو کیڑے پیدا ہوتے ہیں ان کیڑوں کو پیس کر اگر لگایا جائے تو اس کے ذریعے سے بعض اوقات یہ بیماری دور ہو جاتی ہے۔ اس وقت میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ! اب میری سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ آپ نے ان کیڑوں کو کس مصلحت سے پیدا کیا ہے۔

غرض اس کائنات کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے، جس کی کوئی نہ کوئی حکمت اور مصلحت نہ ہو، اللہ تعالیٰ کے علم میں ہر چیز کے فوائد اور حکمتیں اور مصلحتیں ہیں۔ بالکل اسی طرح جو کھانا آپ کو پسند نہیں ہے یا اس کے کھانے کو طبیعت نہیں چاہتی، لیکن اس کی پیدائش میں کوئی نہ کوئی حکمت اور مصلحت ضرور ہے اور کم از کم یہ بات موجود ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا رزق ہے اور اس کا احترام کرنا ضروری ہے۔ اس لیے اگر کوئی کھانا پسند نہیں ہے تو اس کو مت کھاؤ، لیکن اُس کو برا بھی مت کہو۔ بعض لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ جب کھانا پسند نہیں آیا تو اس میں عیب نکالنے شروع کر دیتے ہیں کہ اس میں یہ خرابی ہے، یہ تو بدذائقہ ہے، ایسی باتیں کہنا درست نہیں۔

رزق کی ناقدری مت کرو

یہ بھی حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بڑی اعلیٰ درجے کی تعلیم ہے کہ اللہ کے رزق کا احترام کرو، اس کا ادب کرو، اس کی بے ادبی نہ کرو۔ آج کل ہمارے معاشرے میں یہ اسلامی ادب بری طرح پامال ہو رہا ہے۔ ہر چیز میں ہم نے غیروں کی نقالی شروع کی تو اس میں بھی ایسا ہی کیا اور اللہ کے رزق کا کوئی ادب باقی نہیں رہا، کھانا بچا تو اٹھا کر کوڑے میں ڈال دیا، بعض اوقات دیکھ کر دل لرز جاتا ہے۔ یہ سب مسلمانوں کے گھروں میں ہو رہا ہے، خاص طور پر دعوتوں میں

اور ہوٹلوں میں غذاؤں کے بڑے بڑے ڈھیر اس طرح کوڑے میں ڈال دیے جاتے ہیں، حالانکہ ہمارے دین کی تعلیم یہ ہے کہ اگر کوئی روٹی کا چھوٹا سا ٹکڑا بھی کہیں پڑا ہوا ہو تو اس کی بھی تعظیم کرو، اس کا بھی ادب کرو اور اس کو اٹھا کر کسی اونچی جگہ رکھ دو۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ اور رزق کی قدر

میں نے اپنے حضرت ڈاکٹر عبد الحئی صاحب رحمہ اللہ سے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کا یہ واقعہ سنا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ بیمار ہوئے اس دوران ایک صاحب نے آپ کو پینے کے لیے دودھ لا کر دیا، آپ نے وہ دودھ پیا اور تھوڑا سا بچ گیا، وہ بچا ہوا دودھ آپ نے سرہانے کی طرف رکھ دیا، اتنے میں آپ کی آنکھ لگ گئی۔ جب وہ بیدار ہوئے تو ایک صاحب جو پاس کھڑے تھے ان سے پوچھا کہ بھائی وہ تھوڑا سا دودھ بچ گیا تھا، وہ کہاں گیا؟ تو اُن صاحب نے کہا کہ حضرت وہ تو پھینک دیا۔ ایک گھونٹ ہی تھا، حضرت تھانوی رحمہ اللہ بہت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ تم نے اللہ کی اس نعمت کو پھینک دیا، تم نے بہت غلط کام کیا، اگر میں اس دودھ کو نہیں پی سکا تو تم خود پی لیتے، کسی اور کو پلا دیتے یا بلی کو پلا دیتے یا طوطے کو پلا دیتے۔ اللہ کی کسی مخلوق کے کام آجاتا، تم نے اس کو کیوں پھینکا؟ اور پھر ایک اصول بیان فرما دیا کہ

> ''جن چیزوں کی زیادہ مقدار سے انسان اپنی عام زندگی میں فائدہ اٹھاتا ہے، ان کی تھوڑی مقدار کی قدر اور تعظیم اس کے ذمے واجب ہے۔''

مثلاً کھانے کی بڑی مقدار کو انسان کھاتا ہے، اس سے اپنی بھوک مٹاتا ہے، اپنی ضروریات پوری کرتا ہے، لیکن اگر اسی کھانے کا تھوڑا سا حصہ بچ جائے تو اس کا احترام اور توقیر بھی اس کے ذمے واجب ہے، اس کو ضائع کرنا جائز نہیں، یہ اصل بھی درحقیقت اُسی حدیث سے ماٗخوذ ہے کہ اللہ کے رزق کی ناقدری مت کرو، اس کو کسی نہ کسی مصرف میں لے آوٴ۔

دسترخوان جھاڑنے کا صحیح طریقہ

میرے والد ماجد رحمہ اللہ کے دارالعلوم دیوبند میں ایک استاد تھے۔ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمہ اللہ، جو ''حضرت میاں صاحب'' کے نام سے مشہور تھے، بڑے عجیب وغریب بزرگ تھے۔ ان کی باتیں سن کر حضراتِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کے زمانے کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ حضرت والد صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں ان کی خدمت گیا تو انہوں نے فرمایا کہ کھانے کا وقت ہے آوٴ کھانا کھالو۔ میں ان کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ جب کھانے سے فارغ ہوئے تو میں نے دسترخوان لپیٹنا شروع کیا، تاکہ میں جا کر دسترخوان جھاڑ دوں تو حضرت میاں صاحب رحمہ اللہ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا: کیا کر رہے ہو؟ میں نے کہا کہ حضرت دسترخوان جھاڑنے جارہا ہوں۔ حضرت میاں صاحب نے پوچھا کہ دسترخوان جھاڑنا آتا ہے؟ میں نے کہا کہ حضرت! دسترخوان جھاڑنا کون سا فن یا علم ہے، جس کے لیے باقاعدہ تعلیم کی ضرورت ہو؟ باہر جا کر جھاڑ دوں گا۔ حضرت میاں صاحب نے فرمایا کہ اس لیے تو میں نے تم سے پوچھا تھا کہ دسترخوان جھاڑنا آتا ہے یا نہیں؟ معلوم ہوا کہ تمہیں دسترخوان جھاڑنا نہیں آتا۔ میں نے کہا پھر آپ سکھادیں۔ فرمایا کہ ہاں! دسترخوان جھاڑنا بھی ایک فن ہے۔

پھر آپ نے اس دسترخوان کو دوبارہ کھولا اور اس دسترخوان پر جو بوٹیاں یا بوٹیوں کے ذرّات تھے، ان کو ایک طرف کیا اور ہڈیوں کو جن پر کچھ گوشت وغیرہ لگا ہوا تھا، ان کو ایک طرف کیا اور روٹی کے ٹکڑوں کو ایک طرف کیا اور روٹی کے جو چھوٹے چھوٹے ذرات تھے، ان کو ایک طرف جمع کیا، پھر مجھ سے فرمایا کہ دیکھو۔ یہ چار چیزیں ہیں اور میرے یہاں ان چار چیزوں کی علیحدہ علیحدہ جگہ مقرر ہے، یہ بوٹیاں ہیں، ان کی فلاں جگہ ہے، بلّی کو معلوم ہے کہ کھانے کے بعد اس جگہ بوٹیاں رکھی جاتی ہیں، وہ آ کر ان کو کھا لیتی ہے اور ان ہڈیوں کے لیے فلاں جگہ مقرر ہے، محلے کے کتوں کو وہ جگہ معلوم ہے، وہ آ کر ان کو کھا لیتے ہیں اور یہ جو روٹیوں کے ٹکڑے ہیں ان کو میں اس دیوار پر رکھتا ہوں، یہاں پرندے، چیل، کوے آتے ہیں اور وہ ان کو اٹھا کر کھا لیتے ہیں اور یہ جو روٹی کے چھوٹے چھوٹے ذرات ہیں، تو میرے گھر میں چیونٹیوں کا بل ہے، ان کو اس بل کے پاس رکھ دیتا ہوں، وہ چونٹیاں اس کو کھا لیتی ہیں، پھر فرمایا کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کا رزق ہے، اس کا کوئی حصہ ضائع نہیں جانا چاہیے۔ حضرت والد صاحب رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ اس دن ہمیں معلوم ہوا کہ دسترخوان جھاڑنا ایک فن ہے اور اس کو بھی سیکھنے کی ضرورت ہے۔

آج ہمارا حال

آج ہمارا یہ حال ہے کہ دسترخوان جو جا کر کوڑے دان کے اندر جھاڑ دیا، اللہ کے رزق کے احترام کا کوئی اہتمام نہیں۔ ارے یہ ساری اللہ کی مخلوقات ہیں، جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ رزق پیدا کیا، اگر تم نہیں کھا سکتے تو کسی اور مخلوق کے لیے اس کو رکھ دو۔ پہلے زمانے میں بچوں کو یہ سکھایا جاتا تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا

رزق ہے اس کا احترام کرو، اگر کہیں روٹی کا ٹکڑا نظر آتا تو اس کو چوم کر ادب کے ساتھ اونچی جگہ پر رکھ دیتے، لیکن جوں جوں مغربی تہذیب کا غلبہ ہمارے معاشرے پر بڑھ رہا ہے، رفتہ رفتہ اسلامی آداب رخصت ہورہے ہیں۔ نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کھانا پسند آئے تو کھالو اور اگر پسند نہ آئے تو کم از کم اس میں عیب مت نکالو، اس کی ناقدری اور بے حرمتی مت کرو، اس سنّت کو دوبارہ زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ سب باتیں کوئی قصہ کہانی یا کوئی افسانہ نہیں ہے، بلکہ یہ سب باتیں عمل کرنے کے لیے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے رزق کا ادب اور اس کی تعظیم کریں اور ان آداب کو اپنائیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سکھائے اور جو ہمارے دین کا حصہ ہیں، جو ہمارے دین کا طرۂ امتیاز ہیں اور یہ مغرب نے جو بلائیں ہم پر نازل کی ہیں ان سے چھٹکارہ حاصل کریں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیقِ عمل عطا فرمائے۔ آمین۔

سرکہ بھی ایک سالن ہے

عن جابر رضی اللہ عنہ أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم سأل أهله الأدم، فقالوا: ما عندنا إلّا خل فدعا به فجعل يأكل به ويقول: "نعم الأدم الخل، نعم الأدم الخل۔"(۱)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لے گئے اور گھر والوں سے فرمایا کہ کچھ سالن ہو تو لے آؤ۔ (روٹی موجود تھی) گھر والوں نے کہا ہمارے

(۱) صحیح مسلم ۱۶۲۲/۳ (۲۰۵۲) ومسند احمد ۱۹۰/۲۳ (۱۴۹۲۵)۔

پاس تو سرکے کے علاوہ کچھ نہیں ہے، سرکہ رکھا ہوا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ وہی لے آؤ، حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سرکے کو روٹی کے ساتھ تناول فرمانا شروع کیا اور ساتھ میں بار بار یہ فرماتے جاتے کہ سرکہ اچھا سالن ہے، سرکہ اچھا سالن ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کی حالت

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کا یہ حال تھا کہ کوئی سالن موجود نہیں، حالانکہ روایات میں آتا ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سال کے شروع میں تمام ازواج مطہرات کے پاس پورے سال کا نان نفقہ اور خرچہ بھیج دیا کرتے تھے، لیکن وہ ازواج بھی حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج تھیں۔ ان کے یہاں صدقات، خیرات اور دوسرے مصارف کی اتنی کثرت تھی کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ بسا اوقات تین تین مہینے تک ہمارے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔ دو چیزوں پر ہمارا گزارا ہوتا تھا کہ کھجور کھالی اور پانی پی لیا۔ (۱)

نعمت کی قدر فرماتے

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو نعمت میسر آجاتی اس کی قدر فرماتے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے، حالانکہ عام معاشرے میں سرکے کو بطور سالن کے استعمال نہیں کیا جاتا، بلکہ زبان کا ذائقہ بدلنے کے لیے

(۱) صحیح البخاری ۱۵۳/۳ (۲۵٦۷) و صحیح مسلم ۲۲۸۲/٤ (۲۹۷۲)۔

لوگ سرکے کو سالن کے ساتھ ملا کر کھاتے ہیں، لیکن حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی سرکے سے روٹی تناول فرمائی اور ساتھ ساتھ اس کی اتنی تعریف فرمائی کہ بار بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اچھا سالن ہے یہ بڑا اچھا سالن ہے۔

کھانے کی تعریف کرنی چاہیے

اسی حدیث کے تحت حضراتِ محدثین نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اس نیت سے سرکہ استعمال کرے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تناول فرمایا اور اس کی تعریف فرمائی تو ان شاء اللہ اس نیت کی وجہ سے اس کو سرکہ کھانے پر بھی ثواب ملے گا۔ اس حدیث سے دوسرا مسئلہ یہ نکلتا ہے کہ جو کھانا آدمی کو پسند آئے، اس کو چاہیے کہ وہ اس کھانے کی کچھ تعریف کرے، تعریف کرنے کا ایک مقصد تو اس کھانے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ کھانا عنایت فرمایا۔ دوسرے یہ کہ جس نے وہ کھانا تیار کیا ہے، اس تعریف کے ذریعے اس کا دل خوش ہوجائے۔ یہ بھی کھانے کے آداب میں سے ہے، یہ نہ ہو کہ کھانے کے ذریعے پیٹ کی بھوک مٹائی اور زبان کا چٹخارہ بھی پورا کیا اور کھانا کھا کے اٹھ گئے، لیکن زبان پر ایک کلمہ بھی شکر اور تعریف کا نہ آیا۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سرکے کی اتنی تعریف فرمائی، لہٰذا جب کھانے پکانے والے نے محنت کی اور اپنے آپ کو آگ اور چولھے کے سامنے پیش کر کے تمہارے لیے کھانا تیار کیا، اس کا اتنا تو حق ادا کرو کہ دو کلمے بول کر اس کی تعریف کردو اور اس کی ہمت افزائی کردو، جو شخص تعریف کے دو کلمے بھی ادا نہ کرے وہ بڑا بخیل ہے۔

پکانے والے کی تعریف کرنی چاہیے

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ نے ایک مرتبہ اپنا یہ واقعہ سنایا کہ ایک صاحب میرے پاس آیا کرتے تھے، وہ اور ان کی بیوی دونوں نے اصلاحی تعلق بھی قائم کیا ہوا تھا۔ ایک دن انہوں نے اپنے گھر پر میری دعوت کی، میں چلا گیا اور جا کر کھانا کھالیا۔ کھانا بڑا لذیذ اور بہت اچھا بنا ہوا تھا۔ حضرت اقدس رحمہ اللہ کی ہمیشہ کی یہ عادت تھی کہ جب کھانے سے فارغ ہوتے تو اس کھانے کی اور کھانا بنانے والی خاتون کی تعریف ضرور کرتے، تاکہ اس پر اللہ کا شکر بھی ادا ہوجائے اور اس خاتون کا دل بڑھ جائے۔ چنانچہ جب کھانے سے فارغ ہوئے تو وہ خاتون پردے کے پیچھے آئیں اور آ کر حضرت والا کو سلام کیا، تو حضرت والا نے فرمایا کہ تم نے بڑا لذیذ اور بہت اچھا کھانا پکایا۔ کھانے میں بڑا مزہ آیا۔

حضرت فرماتے ہیں کہ جب میں نے یہ کہا تو پردے کے پیچھے سے اس خاتون کے رونے اور سسکیاں لینے کی آواز آئی۔ میں حیران ہوگیا کہ معلوم نہیں میری کس بات سے ان کو تکلیف ہوئی اور ان کا دل ٹوٹا۔ میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ آپ کیوں رو رہی ہیں؟ ان خاتون نے بمشکل اپنے رونے پر قابو پاتے ہوئے کہا کہ حضرت مجھے ان (شوہر) کے ساتھ رہتے ہوئے چالیس سال ہوگئے ہیں، لیکن اس پورے عرصے میں ان کی زبان سے میں نے یہ جملہ نہیں سنا کہ ''آج کھانا بڑا اچھا پکا ہے۔'' آج جب آپ کی زبان سے یہ جملہ سنا تو مجھے رونا آگیا۔ چونکہ وہ صاحب حضرت والا کے تربیت یافتہ تھے اس لیے حضرت والا نے ان سے فرمایا کہ خدا کے بندے! ایسا بھی کیا بخل کرنا کہ آدمی کسی کی تعریف میں دو لفظ نہ کہے، جس سے اس کے دل کو خوشی ہوجائے۔ لہٰذا کھانے کے بعد اس

کھانے کی تعریف اور اس کے پکانے والی کی تعریف کرنی چاہیے، تاکہ اس کھانے پر اللہ کا شکر بھی ادا ہو جائے اور کھانا بنانے والے کا دل بھی خوش ہو جائے۔

ہدیے کی تعریف

عام طور پر تو لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ جب ان کو ہدیہ پیش کیا جائے تو وہ تکلفاً کہتے ہیں کہ بھائی، اس ہدیے کی کیا ضرورت تھی؟ آپ نے بے کار میں تکلف کیا، لیکن ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ کو دیکھا کہ جب حضرت کے بے تکلف احباب میں سے کوئی محبت کے ساتھ ان کی خدمت میں ہدیہ پیش کرتا، تو حضرت والا تکلف نہیں فرماتے تھے، بلکہ اس ہدیہ کی طرف بہت اشتیاق کا اظہار فرماتے اور یہ کہتے بھائی، تم تو ایسی چیز لے کر آئے جس کی ہمیں ضرورت تھی۔

ایک مرتبہ میں حضرت والا کی خدمت میں ایک کپڑا لے گیا اور مجھے اس بات کا تصور بھی نہیں تھا کہ حضرت والا اس پر اتنی خوشی کا اظہار فرمائیں گے۔ چنانچہ جب میں نے وہ پیش کیا تو حضرت والا نے فرمایا کہ ہمیں ایسے کپڑے کی ضرورت تھی۔ ہم تو اس کی تلاش میں تھے اور فرمایا کہ جس رنگ کا کپڑا لائے ہو، یہ رنگ تو ہمیں پسند ہے اور یہ کپڑا بھی بہت اچھا ہے۔ بار بار اس کی تعریف کرتے اور فرماتے تھے کہ جب ایک شخص محبت سے ہدیہ لے کر آیا ہے تو کم از کم اتنی تعریف تو اس کی کرو کہ اس کی محبت کی قدر دانی ہو جائے اور اس کا دل خوش ہو جائے کہ جو چیز میں نے ہدیہ میں پیش کی، وہ پسند آگئی اور یہ جو حدیث شریف میں ہے کہ

''تھادُوا تحابُوا''[1]

یعنی آپس میں ہدیہ دیا کرو، اور اس کے ذریعے محبت میں اضافہ کرو۔

تو محبت میں اضافہ کا ذریعہ اس وقت ہوگا جب تم ہدیہ وصول کر کے اس پر پسندیدگی اور محبت کا اظہار کرو۔

بندوں کا شکریہ ادا کردو

ایک حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ''[2]

جو شخص انسانوں کا شکر ادا نہیں کرتا۔ وہ اللہ کا بھی شکر ادا نہیں کرتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص بھی تمہارے ساتھ محبت اور اخلاص کا معاملہ کرے اور اس کے ذریعے سے تمہیں کوئی فائدہ پہنچے تو کم از کم زبان سے اس کا شکریہ ادا کردو اور اس کی تعریف میں دو کلمے تو کہہ دو، یہ سنّت ہے۔ اس لیے کہ یہ سب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہیں۔ اگر ہم ان طریقوں کو اپنا لیں تو دیکھو کتنی محبتیں پیدا ہوتی ہیں اور تعلقات میں کتنی خوشگواریاں پیدا ہوتی ہیں، پھر

(۱) موطا امام مالک ۹۰۸/۲ (۱٦) طبع دار احیاء التراث العربی۔ والادب المفرد للبخاری ۳۰٦ (۵۹٤) طبع مکتبۃ المعارف الریاض۔ والحدیث ذکرہ العراقی فی ''تخریج احادیث الاحیاء'' ۳۸٦/۱ (۱٤۵۳) وقال بسند جید۔ (طبع مکتبۃ طبریۃ)۔

(۲) سنن الترمذی ۵۰۵/۳ (۱۹۵۵) وقال ہذا حدیث حسن۔ و مسند احمد ۳۸۰/۱۷ (۱۱۲۸۰)۔

یہ عداوتیں اور نفرتیں، یہ بغض اور یہ سب دشمنیاں ختم ہوجائیں گی، بشرطیکہ انسان حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر ٹھیک ٹھیک عمل کرلے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سوتیلے بیٹے کو ادب سکھانا

عن عمر بن أبی سلمة رضی اللہ عنہ قال كنت غلاما فی حجر رسول الله ﷺ، وكانت يدی تطيش فی الصحفة قال له رسول الله ﷺ: «يا غلام! سمِ الله وكل بيمينك وكل مما يليك».[1]

یہ حدیث پیچھے گزرچکی ہے حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ یہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سوتیلے بیٹے تھے، حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا پہلے حضرت ابو سلمہ رضی اللہ عنہ کی بیوی تھیں، ان کے انتقال کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا تھا اور یہ حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے تھے، نکاح کے بعد یہ بھی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ آگئے تھے، اس طرح یہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سوتیلے بیٹے بن گئے اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ تربیت رہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ جب میں بچہ تھا اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ تربیت تھا، ایک مرتبہ جب میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانے کے لیے بیٹھا، تو کھانے کے دوران میرا ہاتھ کھانے کے برتن کے چاروں طرف حرکت کرتا تھا۔

---

(۱) صحیح البخاری ۶۸/۷ (۵۳۷۶) وصحیح مسلم ۱۵۹۹/۳ (۲۰۲۲)۔

ایک نوالہ اس طرف سے لیا، دوسرا نوالہ اس طرف سے کھالیا۔ تیسرا نوالہ کسی اور طرف سے کھالیا، پھر جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے میری یہ حرکت دیکھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے لڑکے! کھانا شروع کرنے سے پہلے اللہ کا نام لو، یعنی ''بسم اللہ پڑھو''۔ اور داہنے ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے سامنے سے کھاؤ، یعنی برتن کا جو حصہ تمہارے سامنے ہے، اس سے کھاؤ۔

اپنے سامنے سے کھانا ادب ہے

اس حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تین آداب بیان فرمائے۔

① یہ ہے کہ بسم اللہ پڑھ کر کھانا کھاؤ۔ اس کے بارے میں پیچھے تفصیل سے بیان ہوگیا

② یہ ہے کہ داہنے ہاتھ سے کھاؤ۔ اس کا بیان بھی پیچھے آچکا ہے۔

③ یہ بیان فرمایا کہ اپنے سامنے سے کھاؤ ادھر اُدھر ہاتھ نہ لے جاؤ۔

اس ادب پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی تاکید فرمائی ہے۔

اس کی ایک وجہ تو بالکل ظاہر ہے، وہ یہ کہ اگر انسان کھانا اپنے سامنے سے کھائے گا تو اس صورت میں اگر کھانے کا کچھ حصہ بچ جائے گا، تو وہ بدنما اور برا معلوم نہیں ہوگا، ورنہ اگر چاروں طرف سے کھائے گا، تو اس صورت میں جو کھانا بچ جائے گا، وہ بدنما ہوجائے گا اور دوسرا آدمی اس کو کھانا چاہے گا تو اس کو کراہیت ہوگی، جس کے نتیجے میں اس کھانے کو ضائع کرنا پڑے گا۔ اس لیے فرمایا کہ اپنے سامنے سے کھاؤ۔

کھانے کے وسط میں برکت نازل ہوتی ہے

ایک حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب کھانا سامنے رکھا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کھانے کے وسط اور درمیان میں برکت نازل ہوتی ہے۔ اب اگر اس کھانے کے درمیان ہی سے کھالیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کھانے کی برکت ختم ہوگئی، اس لیے اگر ایک طرف سے کھانا کھایا جائے گا، تو اللہ تعالیٰ کی برکت زیادہ دیر تک برقرار رہے گی، اب سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ برکت کیا چیز ہے اور درمیان میں کس طرح نازل ہوتی ہے؟ یہ ساری باتیں ایسی ہیں جن کو ہم اپنی محدود عقل سے نہیں سمجھ سکتے، یہ اللہ تعالیٰ کی حکمتیں ہیں، وہ جانیں اور ان کے رسول ﷺ جانیں، ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ بس ہمیں تو یہ ادب سکھادیا کہ اپنے سامنے سے کھاؤ، اِدھر اُدھر سے مت کھاؤ۔ (۱)

اگر مختلف اشیاء ہوں تو آگے ہاتھ بڑھا سکتے ہیں

لیکن یہ اب اس وقت ہے، جب کھانا ایک قسم کا ہو۔ اگر برتن کے اندر مختلف انواع کی چیزیں رکھی ہیں، تو اس صورت میں اپنی پسند اور اپنی مطلب کی چیز لینے کے لیے ہاتھ اِدھر اُدھر، دائیں بائیں جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ چنانچہ عکراش بن ذؤیب رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، حضورِ اقدس ﷺ مجھے

(۱) سنن ابی داود ۳۴۸/۳ (۳۷۷۲) وسنن الترمذی ۳۹۷/۳ (۱۸۰۵) وقال هذا حديث حسن صحيح۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر لے گئے، تو ہمارے سامنے دسترخوان پر ''ثرید'' لایا گیا۔ ''ثرید'' اسے کہتے ہیں کہ روٹی کے ٹکڑے توڑ توڑ کر شوربے میں بھگو دیئے جاتے ہیں، پھر اس کو کھایا جاتا ہے۔ یہ کھانا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت پسند تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی فضیلت بھی بیان فرمائی ہے کہ ''ثرید'' بڑا اچھا کھانا ہے۔ (1) بہر حال! حضرت عکراش رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے ثرید کھانا شروع کیا تو میں کھانے کے دوران ایک نوالہ یہاں سے لیتا، دوسرا آگے سے لیتا۔ کبھی اِدھر سے کبھی اُدھر سے نوالہ لیتا۔ جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے میری یہ حرکت دیکھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''یاعکراش کل من موضع واحد فانه طعام''

ترجمہ: اے عکراش! اپنے سامنے سے کھانا کھاؤ اس لیے کہ ایک ہی قسم کا کھانا ہے۔

چنانچہ میں نے ایک ہی جگہ سے کھانا شروع کردیا، جب کھانے سے فارغ ہوگئے تو ہمارے سامنے ایک بڑا تھال لایا گیا، جس میں مختلف قسم کی کھجوریں تھیں۔ کوئی کس رنگ کی، کوئی کس رنگ کی، کوئی عمدہ، کوئی درمیانی، کوئی تر، کوئی خشک۔ مثل مشہور ہے کہ دودھ کا جلا چھاچ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ چونکہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے تلقین فرمائی تھی کہ اپنے سامنے سے کھانا چاہیے، اس لیے میں صرف اپنے سامنے کی کھجوریں کھاتا رہا اور میں نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ کبھی یہاں جارہا ہے کبھی وہاں جارہا ہے، جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھا کہ میں ایک ہی جگہ سے

(1) ملاحظہ فرمائیں صحیح البخاری ۷/۷۵ (۵۴۱۸) و صحیح مسلم ۴/۱۸۸۶ (۳۴۳۱)۔

کھا رہا ہوں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"یا عکراش! کل من حیث شئت فانّہ غیر لون واحد"

اے عکراش! اب جہاں سے چاہو، کھاؤ، اس لیے کہ یہ کھجوریں مختلف قسم کی ہیں اب مختلف جگہوں سے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بہر حال، اس حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ادب سکھا دیا کہ جب ایک قسم کا کھانا ہو تو اپنے سامنے سے کھانا چاہیے اور جب مختلف قسم کے کھانے دسترخوان پر چنے ہوئے ہوں تو اِدھر اُدھر ہاتھ بڑھانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔(۱)

بائیں ہاتھ سے کھانا جائز نہیں

وعن سلمة بن الاکوع رضی اللہ عنہ أن رجلاً أکل عند رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم بشماله، فقال: "کل بیمینك"، قال: "لا استطیع"، قال: "لا استطعت"، مامنعه الّا الکبر فما رفعها الیٰ فیه۔"(۲)

حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ کر بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ دائیں ہاتھ سے کھانا کھاؤ! اس شخص نے جواب میں کہا کہ میں دائیں ہاتھ

(۱) سنن الترمذی ۴۲۷/۳ (۱۸۴۸) وقال هذا حدیث غریب۔ وسنن ابن ماجه ۱۹/۵ (۳۲۷٤)۔

(۲) صحیح مسلم ۱۵۹۹/۳ (۲۰۲۱)۔ ومسند احمد ۲۰/۲۷ (۱٦٤۹۳)۔

سے کھانا نہیں کھا سکتا (بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص منافق تھا اور اس کے دائیں ہاتھ میں کوئی خرابی اور عذر بھی نہیں تھا، ویسے ہی اس نے جھوٹ بول دیا کہ میں نہیں کھا سکتا) اس لیے کہ بعض لوگوں کی طبیعت ایسی ہوتی ہے کہ وہ غلطی ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے، بلکہ اپنی بات پر اڑے رہتے ہیں۔ اسی طرح یہ شخص بھی بائیں ہاتھ سے کھا رہا تھا۔ حضورِ اقدس ﷺ نے ٹوکا، شاید اس کو حضور اکرم ﷺ کا ٹوکنا پسند نہیں آیا۔ اس لیے اس نے صاف کہہ دیا کہ میں دائیں ہاتھ سے نہیں کھا سکتا اور حضور اکرم ﷺ کے سامنے جھوٹ بول دیا اور نبی ﷺ کے سامنے جھوٹ بولنا یا غلط بات کہنا اور بلا وجہ اپنی غلطی چھپانا اللہ تعالیٰ کو انتہائی ناپسند ہے۔ چنانچہ حضورِ اقدس ﷺ نے اس کو بد دعا دیتے ہوئے فرمایا:

"لا استطعت"

یعنی تمہیں دائیں ہاتھ سے کھانے کی کبھی طاقت نہ ہو،

چنانچہ روایت میں آتا ہے کہ اس کے بعد اُس شخص کی یہ حالت ہوگئی کہ اگر کبھی اپنے دائیں ہاتھ کو منہ تک لے جانا بھی چاہتا تب بھی نہیں اٹھا سکتا تھا، اللہ تعالیٰ محفوظ فرمائے۔ آمین۔

غلطی کا اعتراف کر کے معافی مانگ لینی چاہیے

اصول یہ ہے کہ اگر بشری تقاضے کی وجہ سے کوئی غلطی سرزد ہوجائے، پھر وہ انسان ندامت اور شرمندگی کا اظہار کرے تو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں، لیکن غلطی ہو اور پھر اس غلطی پر اصرار ہو اور سینہ زوری ہو اور اس کو صحیح ثابت کرنے

کی کوششیں بھی کرے اور پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جھوٹ بولے، یہ بڑا سنگین گناہ ہے۔

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی کے حق میں بددعا کرنا شاذ و نادر ہی ثابت ہے حتیٰ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دشمنوں کے حق میں بددعا نہیں فرمائی، جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں لڑ رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تلوار اٹھا رہے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تیروں کی بارش کر رہے ہیں، ان کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بددعا نہیں فرمائی، بلکہ یہ دعا دی کہ

اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِي فَإِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ [1]

اے اللہ! میری قوم کو ہدایت دے دیجیے، یہ مجھے جانتے نہیں۔

لیکن یہ موقع ایسا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی معلوم ہوگیا تھا کہ یہ شخص تکبر کی وجہ سے بطورِ عناد کے منافقت کی بنیاد پر دائیں ہاتھ سے کھانے سے انکار کر رہا ہے، حقیقت میں اس کا کوئی عذر نہیں ہے۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حق میں بددعا کا کلمہ ارشاد فرمایا اور وہ بددعا فوراً قبول ہوگئی۔

---

(۱) شعب الایمان للبیہقی ۴۵/۳ (۱۳۷۵) طبع مکتبة الرشد۔الریاض۔ والمعجم الکبیر للطبرانی ۱۶۲/۶ (۵۸۶۲) بلفظ: "اللھم اغفر لقومي ..."، وقال الہیثمی فی "مجمع الزوائد" ۱۱۷/۶ (۱۰۰۹۷): رواه الطبراني في "الكبير"، ورجاله رجاله الصحيح. (مکتبة القدسی القاھرة)

اپنی غلطی پر اڑنا درست نہیں

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبد الحئی صاحب رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر آدمی غلط کاری اور گناہوں میں مبتلا ہو، پھر بھی بزرگوں اور اللہ والوں کے پاس اسی حال میں چلا جائے، اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن وہاں جا کر اگر جھوٹ بولے گا یا اپنی غلطی پر اڑا رہے گا تو یہ بڑی خطرناک بات ہے، انبیاء علیہم السلام کی شان تو بہت بڑی ہے، بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ حضراتِ انبیاء علیہم السلام کے وارثین پر بھی اللہ تعالیٰ بعض اوقات یہ فضل فرما دیتے ہیں کہ ان کو تمہاری حقیقتِ حال سے باخبر فرما دیتے ہیں، چنانچہ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ ہی نے حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا یہ واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ حضرت والا کی مجلس ہو رہی تھی، حضرت والا وعظ فرما رہے تھے، ایک صاحب اسی مجلس میں دیوار یا تکیے کا ٹیک لگا کر متکبرانہ انداز میں بیٹھ گئے۔ اسی طرح ٹیک لگا کر پاؤں پھیلا کر بیٹھنا مجلس کے ادب کے خلاف ہے اور جو شخص بھی مجلس میں آتا تھا وہ اپنی اصلاح ہی کی غرض سے آتا تھا، اس لیے کوئی غلط کام کرتا تو حضرت والا کا فرض تھا کہ اس کو ٹوکیں، چنانچہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس شخص کو ٹوک دیا اور فرمایا کہ اس طرح بیٹھنا مجلس کے ادب کے خلاف ہے؛ آپ ٹھیک سے ادب کے ساتھ بیٹھ جائیں، ان صاحب نے بجائے سیدھے بیٹھنے کے عذر بیان کرتے ہوئے کہا: حضرت! میری کمر میں تکلیف ہے، اس وجہ سے میں اس طرح بیٹھا ہوں، بظاہر وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ آپ کا یہ ٹوکنا غلط ہے، اس لیے کہ آپ کو کیا معلوم کہ میں کس حالت میں ہوں، کس تکلیف میں مبتلا ہوں، آپ کو مجھے ٹوکنا نہیں چاہیے تھا۔ حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ خود بیان فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت تھانوی رحمہ اللہ کو دیکھا

کہ آپ نے ایک لمحے کے لیے گردن جھکائی اور آنکھ بند کی اور پھر گردن اٹھا کر اس سے فرمایا کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں، آپ کی کمر میں کوئی تکلیف نہیں ہے۔ آپ مجلس سے اٹھ جایئے، یہ کہہ کر ڈانٹ کر اٹھادیا۔ اب بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا رحمۃ اللہ کو کیا پتہ کہ اس کی کمر میں تکلیف ہے یا نہیں؟ لیکن بعض اوقات اللہ تعالیٰ اپنے کسی نیک بندے کو کسی واقعے کی خبر عطا فرمادیتے ہیں۔ لہٰذا بزرگوں سے جھوٹ بولنا یا ان کو دھوکہ دینا بڑی خطرناک بات ہے، اگر غلطی ہوجائے اور کوتاہی ہوجائے، اس کے بعد آدمی اس پر نادم ہوجائے اور اللہ تعالیٰ اس پر توبہ کی توفیق دے دے تو ان شاء اللہ وہ گناہ اور غلطی معاف ہوجائے گی۔

بہر حال! حضرت والا نے اس شخص کو مجلس سے اٹھادیا، بعد میں لوگوں نے اس شخص سے پوچھا تو اس نے صاف صاف بتادیا کہ واقعتا حضرت والا نے صحیح فرمایا تھا، میری کمر میں کوئی تکلیف نہیں تھی، میں نے محض اپنی بات رکھنے کے لیے یہ بات بنائی تھی۔

بزرگوں کی شان میں گستاخی سے بچو

دیکھیے گناہ، غلطی، کوتاہی، دنیا میں کس سے نہیں ہوتی؟ انسان سے غلطی اور کوتاہی ہوہی جاتی ہے، اگر کوئی شخص بزرگوں کی بات پر نہیں چل رہا ہے تو بھی اللہ تعالیٰ کسی وقت توبہ کی توفیق دے دیں گے، اس کی خطا کو معاف فرمادیں گے، لیکن بزرگوں کی شان میں گستاخی کرنا یا ان کے لیے بُرے کلمات زبان سے نکالنا اور اپنے گناہ کو صحیح ثابت کرنا، یہ اتنی بری لعنت ہے کہ بسا اوقات اس

کی وجہ سے ایمان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بچائے۔اس لیے اگر کسی اللہ والے کی کوئی بات پسند نہ آئے، تو کوئی بات نہیں، ٹھیک ہے پسند نہیں آئی لیکن اس کی وجہ سے ان کے حق میں کوئی ایسا کلمہ نہ کہو جو بے عزتی اور گستاخی کی ہو، کہیں ایسا نہ کہ وہ کلمہ اللہ تعالیٰ کو ناگوار ہو جائے، تو انسان کا ایمان اور اس کی زندگی خطرے میں پڑ جائے۔ اللہ تعالیٰ حفاظت فرمائے۔ آمین۔

آج کل لوگوں میں یہ بیماری پیدا ہوگئی ہے کہ غلطی کو غلطی تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں اور گناہ کو گناہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ چوری اور پھر سینہ زوری۔ گناہ بھی کر رہے ہیں اور پھر گناہ کو صحیح ثابت کرنے کی فکر میں ہیں، مثلاً کسی بزرگ کے بارے میں یہ کہہ دینا وہ تو دکاندار آدمی تھے۔ ایسے ویسے تھے۔ ایسے کلمات زبان سے نکالنا بڑی خطرناک بات ہے۔ اس سے خود پرہیز کریں اور دوسروں کو بچانے کی فکر کریں۔

دو کھجوریں ایک ساتھ مت کھاؤ

”عن جبله بن سحيم رضي الله عنه قال: اصابنا عام سنة مع ابن الزبير رضي الله عنهما فرزقنا تمرًا، فكان عبد الله بن عمر رضي الله عنهما مر بنا ونحن نأكل، فيقول: لا تقارنوا، فان النبي صلى الله عليه وسلم نهى عن القِران، ثم يقول: الا أن يستأذن الرجل أخاه.“(۱)

حضرت جبلہ بن سحیم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی

(۱) صحيح البخاري ۸۰/۷ (۵٤٤٦) وصحيح مسلم ۱٦۱۷/۳ (۲۰٤۵)۔

حکومت کے زمانے میں ہمارے اوپر قحط پڑا، قحط کی حالت میں اللہ تعالیٰ نے کھانے کے لیے کچھ کھجوریں عطا فرمادیں، جب ہم وہ کھجوریں کھا رہے تھے۔ اس وقت حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہمارے پاس سے گزرے، انہوں نے ہم سے فرمایا کہ دو دو کھجوریں ایک ساتھ مت کھاؤ، اس لیے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح دو دو کھجوریں ایک ساتھ ملا کر کھانے سے منع فرمایا ہے۔ دو دو کھجوریں ایک ساتھ ملا کر کھانے کو عربی میں ''قِران'' کہتے ہیں۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے منع فرمایا کہ جو کھجوریں کھانے کے لیے رکھی ہیں اس میں سب کھانے والوں کا برابر مشترک حق ہے، اب اگر دوسرے لوگ تو ایک ایک کھجور اٹھا کر کھا رہے ہیں اور تم نے دو کھجوریں اٹھا کر کھانی شروع کر دیں تب تم دوسروں کا حق مار رہے ہو اور دوسروں کا حق مارنا جائز نہیں۔ البتہ اگر دوسرے لوگ بھی دو دو کھجوریں کھا رہے ہیں تب تم بھی دو دو اٹھا کر کھالو، تو صحیح طریقہ یہ ہے کہ جس طرح دوسرے لوگ کھا رہے ہیں تم بھی اسی طریقے سے کھاؤ۔ اس حدیث سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ دوسروں کا حق مارنا جائز نہیں۔

مشترک چیز کے استعمال کا طریقہ

اس حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اصول بیان فرمادیا کہ جو چیز مشترک ہو اور سب لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوں، اس مشترک چیز سے کوئی شخص دوسرے لوگوں سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے تو یہ جائز نہیں۔ اس لیے کہ اس کی وجہ سے دوسروں کا حق فوت ہوجائے گا، اس اصول کا تعلق صرف کھجور سے نہیں، بلکہ حقیقت میں زندگی کے ان تمام شعبوں سے اس کا تعلق ہے، جہاں چیزوں میں اشتراک پایا جاتا ہے، مثلاً آج کل کی دعوتوں میں

''سیلف سروس'' کا رواج ہے کہ آدمی خود اُٹھ کر جائے اور اپنا کھانا لائے اور کھانا کھائے، اب اسی کھانے میں تمام کھانے والوں کا مشترک حق ہے۔ اب اگر ایک شخص جا کر بہت سارا کھانا اپنے برتن میں ڈال کر لے آیا اور دوسرے لوگ اسے دیکھتے رہ گئے۔ تو یہ بھی اس اصول کے تحت ناجائز اور اس ''قِران'' میں داخل ہے جس سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

پلیٹ میں کھانا احتیاط سے نکالو

اس اصول کے ذریعے امت کو یہ تعلیم دینی مقصود ہے کہ ایک مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ ایثار سے کام لے، نہ یہ کہ وہ دوسروں کے حق پر ڈاکہ ڈالے۔ چاہے وہ حق چھوٹا سا کیوں نہ ہو، لہٰذا جب آدمی کوئی عمل کرے تو دوسروں کا حق مدنظر رکھتے ہوئے کام کرے، یہ نہ ہو کہ بس، مجھے مل جائے، چاہے دوسروں کو ملے یا نہ ملے۔

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے دسترخوان پر بیٹھ کر یہی مسئلہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ جب کھانا دسترخوان پر آئے تو یہ دیکھو کہ دسترخوان پر کتنے آدمی کھانے والے ہیں اور جو چیز دسترخوان پر آئی ہے وہ سب کے درمیان برابر تقسیم کی جائے تو تمہارے حصے میں کتنی آئے گی؟ بس اس حساب سے وہ چیز تم کھالو، اگر اس سے زیادہ کھاؤ گے تو یہ ''قِران'' میں داخل ہے جو ناجائز ہے۔

ریل میں زائد نشست پر قبضہ کرنا جائز نہیں

ایک مرتبہ والد ماجد رحمہ اللہ نے یہ مسئلہ بیان فرمایا کہ تم ریل گاڑی میں سفر

کرتے ہو۔ تم نے ریل گاڑی کے ڈبے میں یہ لکھا ہوا دیکھا ہوگا کہ اس ڈبے میں ۲۲ مسافروں کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ اب آپ نے پہلے جاکر تین چار نشستوں پر قبضہ کرلیا اور اپنے لیے خاص کرلیا اور اس پر بستر لگا کر لیٹ گئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ سوار ہوئے ان کو بیٹھنے کے لیے سیٹ نہیں ملی، اب وہ کھڑے ہیں اور آپ لیٹے ہوئے ہیں۔ فرمایا کہ یہ بھی ''قِران'' میں داخل ہے۔ جو ناجائز ہے۔ اس لیے کہ تمہارا حق تو صرف اتنا تھا کہ ایک آدمی کی نشست پر بیٹھ جاتے، لیکن جب آپ نے کئی نشستوں پر قبضہ کر کے دوسروں کے حق کو پامال کیا تو اس عمل کے ذریعے تم نے دو گناہ کیے۔ ایک یہ کہ تم نے صرف ایک سیٹ کا ٹکٹ خریدا تھا، پھر جب تم نے اس سے زیادہ سیٹوں پر قبضہ کرلیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پیسے دیے بغیر تم نے اپنے حق سے زیادہ قبضہ کرلیا۔ دوسرا گناہ یہ کیا کہ دوسرے مسلمان بھائیوں کی سیٹ پر قبضہ کرلیا، ان کا حق پامال کیا، اس طرح اس عمل کے ذریعے دو گناہوں کے مرتکب ہوئے، پہلے گناہ کے ذریعے حق اللہ پامال ہوا اور دوسرے گناہ کے ذریعے بندہ کا حق پامال ہوا۔

ساتھ سفر کرنے والے کے حقوق

اور یہ بندے کا ایسا حق ہے کہ جس کو بندوں سے معاف کرانا بھی مشکل ہے اس لیے کہ بندوں کے حق اس وقت تک معاف نہیں ہوتے، جب تک صاحبِ حق معاف نہ کرے، محض توبہ کرنے سے معاف نہیں۔ اب اگر کسی وقت اللہ تعالیٰ نے توبہ کی توفیق دی اور دل میں یہ خیال آیا کہ مجھ سے یہ غلطی ہوگئی تھی تو اب اس وقت اس شخص کو کہاں تلاش کروگے جس نے تمہارے ساتھ ریل گاڑی میں سفر کیا تھا اور تم نے اس کا حق ضائع کر دیا تھا، اس لیے اب معافی کا

کوئی راستہ نہیں۔ اس لیے ان معاملات میں بہت اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآنِ کریم نے کئی مقامات پر اس بات کا حکم دیا کہ

وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ (۱)

یعنی "صاحب بالجنب" کا حق ادا کرو، "صاحب بالجنب" اس کو کہتے ہیں جو کسی وقت عارضی طور پر ریل کے سفر میں یا بس میں یا جہاز میں، تمہارے ساتھ آ کر بیٹھ گیا ہو۔ وہ "صاحب بالجنب" ہے، اس کے بھی حقوق ہیں۔ ان حقوق کو ضائع نہ کرو اور اس کے ساتھ ایثار سے کام لو۔ ذرا سی دیر کا سفر ہے، ختم ہو جائے گا، لیکن اگر سفر کے دوران تم نے اپنے ذمے گناہ لازم کر لیا تو وہ گناہ ساری عمر تمہارے نامہ اعمال میں لکھا رہے گا، اس کی معافی ہونی مشکل ہے، یہ سب "قِران" میں داخل ہے اور ناجائز ہے۔

مشترکہ کاروبار میں حساب کتاب شرعاً ضروری ہے

آج کل یہ وبا بھی عام ہے کہ چند بھائیوں کا مشترک کاروبار ہے، لیکن حساب کتاب کوئی نہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم سب بھائی ہیں، حساب کتاب کی کیا ضرورت ہے؟ حساب کتاب تو غیروں میں ہوتا ہے، اپنوں میں حساب کتاب کہاں؟ اب کوئی حساب کتاب، کوئی لکھت پڑھت نہیں کہ کس بھائی کی کتنی ملکیت اور کتنا حصہ ہے؟ ماہانہ کس کو کتنا نفع دیا جائے گا؟ اس کا کوئی حساب نہیں، بلکہ الل ٹپ معاملہ چل رہا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ دنوں تک تو محبت و پیار سے حساب چلتا رہتا ہے، لیکن بعد میں دلوں میں شکوے شکایتیں پیدا ہونا

(۱) سورۃ النساء آیت (۳۶)۔

شروع ہوجاتی ہیں کہ فلاں کی اولاد تو اتنی ہے، وہ زیادہ رقم لیتا ہے، فلاں کی اولاد کم ہے، وہ کم لیتا ہے، فلاں کی شادی پر اتنا خرچ کیا گیا، ہمارے بیٹے کی شادی پر کم خرچ ہوا، فلاں نے کاروبار سے اتنا فائدہ اٹھالیا، ہم نے نہیں اٹھایا وغیرہ۔ بس اس طرح کی شکایتیں شروع ہوجاتی ہیں۔

یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے سے دور چلے گئے یاد رکھیے! ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اگر کوئی مشترک چیز ہے تو اس مشترک چیز کا حساب و کتاب رکھا جائے، اگر حساب و کتاب نہیں رکھا جارہا ہے تو تم خود بھی گناہ میں مبتلا ہورہے ہو اور دوسروں کو بھی گناہ میں مبتلا کر رہے ہو یاد رکھیے! بھائیوں کے درمیان معاملات کے اندر جو محبت و پیار ہوتا ہے، وہ کچھ دن چلتا ہے، بعد میں وہ لڑائی جھگڑوں میں تبدیل ہوجاتا ہے اور پھر وہ لڑائی جھگڑا ختم ہونے کو نہیں آتا۔ کتنی مثالیں اس وقت میرے سامنے موجود ہیں۔

ملکیتوں میں امتیاز شرعاً ضروری ہے

ملکیتوں میں امتیاز ہونا ضروری ہے، یہاں تک کہ باپ بیٹے کی ملکیت میں اور شوہر بیوی کی ملکیت میں امتیاز ہونا ضروری ہے۔ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی دو بیویاں تھیں، دونوں کے گھر الگ الگ تھے، حضرت والا رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ میری ملکیت اور میری دونوں بیویوں کی ملکیت بالکل الگ الگ کر کے امتیاز کر رکھا ہے، وہ اس طرح کہ جو کچھ سامان بڑی اہلیہ کے گھر میں ہے، وہ ان کی ملکیت ہے اور جو سامان چھوٹی اہلیہ کے گھر میں ہے، وہ ان کی ملکیت ہے اور

جو سامان خانقاہ میں ہے، وہ میری ملکیت ہے، آج اگر میں دنیا سے چلا جاؤں تو کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔ الحمد للہ سب امتیاز موجود ہے۔

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ اور ملکیت کی وضاحت

میں نے اپنے والد ماجد رحمہ اللہ کو بھی اسی طرح دیکھا کہ ہر چیز میں ملکیت واضح کر دینے کا معمول تھا۔ آخری عمر میں حضرت والد صاحب رحمہ اللہ نے اپنے کمرے میں ایک چار پائی ڈال لی تھی، دن رات وہیں رہتے تھے ہم لوگ ہر وقت حاضر خدمت رہا کرتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ جب میں ضرورت کی کوئی چیز دوسرے کمرے سے ان کے کمرے میں لاتا تو ضرورت پوری ہونے کے بعد فوراً فرماتے کہ اس چیز کو واپس لے جاؤ۔ اگر کبھی واپس لے جانے میں دیر ہوجاتی تو ناراض ہوتے کہ میں نے تم سے کہا تھا کہ واپس پہنچادو، ابھی تک واپس کیوں نہیں پہنچائی؟

کبھی کبھی ہمارے دل میں خیال آتا کہ ایسے جلدی واپس لے جانے کی کیا ضرورت ہے؟ ابھی واپس پہنچادیں گے، ایک دن خود والد ماجد رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ میں نے اپنے وصیت نامے میں لکھ دیا ہے کہ میرے کمرے میں جو چیزیں ہیں، وہ سب میری ملکیت ہیں اور اہلیہ کے کمرے میں جو چیزیں ہیں وہ ان کی ملکیت ہے، لہٰذا جب میرے کمرے میں کسی دوسرے کی چیز آجاتی ہے تو مجھے خیال ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا انتقال اس حالت میں ہوجائے کہ وہ چیز میرے کمرے کے اندر ہو، اس لیے وصیت نامے کے مطابق وہ چیز میری ملکیت تصور کی جائے گی، حالانکہ حقیقت میں وہ چیز

میری ملکیت نہیں ہے۔ اس لیے میں اس بات کا اہتمام کرتا ہوں اور تمہیں کہتا ہوں کہ یہ چیز جلدی واپس لے جاؤ۔

یہ سب باتیں بھی دین کا حصہ ہیں۔ آج ہم نے ان کو دین سے خارج کردیا ہے اور یہی باتیں بڑوں سے سیکھنے کی ہیں اور یہ سب باتیں اسی اصول سے نکل رہی ہیں جو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بیان فرمایا کہ ''قِران سے بچو۔''

مشترک چیزوں کے استعمال کا طریقہ

میرے والد ماجد رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ گھر میں بعض اشیاء مشترک استعمال کی ہوتی ہیں جس کو گھر کا ہر فرد استعمال کرتا ہے اور ان کی ایک جگہ مقرر ہوتی ہے کہ فلاں چیز فلاں جگہ پر رکھی جائے گی۔ مثلاً گلاس فلاں جگہ رکھا جائے گا، پیالہ فلاں جگہ رکھا جائے گا، صابن فلان جگہ رکھا جائے گا، ہمیں فرمایا کرتے تھے کہ تم لوگ ان چیزوں کو استعمال کر کے بے جگہ رکھ دیتے ہو، تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارا یہ عمل گناہِ کبیرہ ہے، اس لیے کہ وہ چیز مشترک استعمال کی ہے، جب دوسرے شخص کو اس کے استعمال کی ضرورت ہوگی تو وہ اس کو اس کی جگہ پر تلاش کرے گا اور جب جگہ پر اس کو وہ چیز نہیں ملے گی تو اس کو تکلیف اور ایذاء ہوگی اور کسی مسلمان کو تکلیف پہنچانا گناہِ کبیرہ ہے۔ ہمارا ذہن کبھی اس طرف گیا بھی نہیں تھا کہ یہ بھی گناہ کی بات ہے، ہم تو سمجھتے تھے کہ یہ تو دنیا داری کا کام ہے، گھر کا انتظامی معاملہ ہے۔ یاد رکھو! زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے، جس کے بارے میں دین کی کوئی ہدایت موجود نہ ہو۔ ہم سب اپنے اپنے

گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ کیا ہم لوگ اس بات کا اہتمام کرتے ہیں کہ مشترک استعمال کی اشیاء استعمال کے بعد ان کی متعین جگہ پر رکھیں، تاکہ دوسروں کو تکلیف نہ ہو؟ اب یہ چھوٹی سی بات ہے، جس میں ہم صرف بے دھیانی اور بے توجہی کی وجہ سے گناہوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ اس لیے کہ ہمیں دین کی فکر نہیں، دین کا خیال نہیں، اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کا احساس نہیں، دوسرے اس لیے کہ ان مسائل سے جہالت اور ناواقفیت بھی آج کل بہت ہے۔

بہر حال! یہ سب باتیں ''قِران'' کے اندر داخل ہیں۔ ویسے تو یہ چھوٹی سی بات ہے کہ دو کھجوروں کو ایک ساتھ ملا کر نہ کھانا چاہیے، لیکن اس سے یہ اصول معلوم ہوا کہ ہر وہ کام کرنا جس سے دوسرے مسلمانوں کو تکلیف ہو یا دوسروں کا حق پامال ہو، سب ''قِران'' میں داخل ہیں۔

مشترک بیت الخلاء کا استعمال

بعض اوقات ایسی بات ہوتی ہے جس کو بتاتے ہوئے شرم آتی ہے، لیکن دین کی باتیں سمجھانے کے لیے شرم کرنا بھی ٹھیک نہیں۔ مثلاً آپ بیت الخلاء میں گئے اور فارغ ہونے کے بعد غلاظت کو بہایا نہیں، ویسے ہی چھوڑ کر چلے آئے۔ حضرت والد صاحب رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ عمل گناہ کبیرہ ہے، اس لیے کہ جب دوسرا شخص بیت الخلاء استعمال کرے گا تو اس کو کراہیت ہوگی اور تکلیف ہوگی اور اس تکلیف کا سبب تم بنے، تم نے اس کو تکلیف پہنچائی اور ایک مسلمان کو تکلیف پہنچا کر تم نے گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کیا۔

غیر مسلموں نے اسلامی اصول اپنا لیے

ایک مرتبہ میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ کے ساتھ ڈھاکہ کے سفر پر گیا۔ ہوائی جہاز کا سفر تھا، راستے میں مجھے غسل خانے میں جانے کی ضرورت پیش آئی، آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہوائی جہاز کے غسل خانے میں واش بیسن کے اوپر یہ عبارت لکھی ہوتی ہے کہ

> ''جب آپ واش بیسن استعمال کرلیں تو اس کے بعد کپڑے سے اس کو صاف اور خشک کردیں، تاکہ بعد میں آنے والے کو کراہیت نہ ہو۔''

جب میں غسل خانے سے واپس آیا تو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ غسل خانے میں واش بیسن پر جو عبارت لکھی ہے، یہ وہی بات ہے جو میں تم لوگوں سے بار بار کہتا رہتا ہوں کہ دوسروں کو تکلیف سے بچانا دین کا حصہ ہے۔ جو ان غیر مسلموں نے اختیار کرلیا ہے، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں ترقی عطا فرمادی ہے اور ہم لوگوں نے ان باتوں کو دین سے خارج کردیا ہے اور دین کو صرف نماز روزے کے اندر محدود کردیا ہے، معاشرت کے اُن آداب کو بالکل چھوڑ دیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم لوگ پستی اور تنزلی کی طرف جارہے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس دنیا کو عالمِ اسباب بنایا ہے، اس میں جیسا عمل اختیار کروگے، اللہ تعالیٰ اس کے ویسے ہی نتائج پیدا فرمائیں گے۔

ایک انگریز خاتون کا واقعہ

گزشتہ سال مجھے لندن جانے کا اتفاق ہوا، پھر وہاں لندن سے ٹرین کے ذریعے ایڈمبر جارہا تھا۔ راستے میں غسل خانے میں جانے کی ضرورت پیش آئی، جب غسل خانے کے پاس گیا تو دیکھا کہ ایک انگریز خاتون دروازے پر کھڑی ہے، میں یہ سمجھا کہ شاید غسل خانہ اس وقت فارغ نہیں ہے اور یہ خاتون اس انتظار میں ہے کہ جب فارغ ہوجائے تو وہ اندر جائے۔ چنانچہ اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا۔ جب کافی دیر گزر گئی کہ نہ تو اندر سے کوئی نکل رہا تھا اور نہ یہ اندر جارہی تھی۔ میں دوبارہ غسل خانے کے قریب گیا تو میں نے دیکھا کہ غسل خانے کے دروازے پر لکھا ہے کہ یہ خالی ہے، اندر کوئی نہیں۔ چنانچہ میں نے ان خاتون سے کہا کہ آپ اندر جانا چاہیں تو چلی جائیں، غسل خانہ تو خالی ہے، ان خاتون نے کہا کہ میں ایک اور وجہ سے کھڑی ہوں، وہ یہ کہ میں اندر ضرورت کے لیے گئی تھی اور ضرورت سے فارغ ہونے کے بعد ابھی میں نے اس کو فلش نہیں کیا تھا کہ اتنے میں گاڑی اسٹیشن پر آکر کھڑی ہوگئی اور قانون یہ ہے کہ جب گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی ہو، اس وقت غسل خانہ استعمال نہیں کرنا چاہیے اور نہ اس میں پانی بہانا چاہیے، اب میں اس انتظار میں ہوں کہ جب گاڑی چل پڑے تو میں اس کو فلش کردوں اور اس میں پہانی بہادوں؛ اور پھر اپنی سیٹ پر واپس جاؤں۔

اب آپ اندازہ لگائیں کہ وہ خاتون صرف اس انتظار میں تھی کہ فلش کرنا رہ گیا تھا اور اب تک فلش بھی اس لیے نہیں کیا تھا کہ یہ قانون کی خلاف ورزی ہوجائے گی۔ اس وقت مجھے حضرت والد صاحب رحمہ اللہ کی یہ بات یاد آگئی، وہ

فرمایا کرتے تھے کہ اس بات کا خیال اور اہتمام کہ آدمی فلش کر کے جائے، اصل میں یہ دین کا حکم ہے، تاکہ بعد میں آنے والے کو تکلیف نہ ہو، لیکن دین کی اس بات پر ایک غیر مسلم نے کس اہتمام سے عمل کیا، آپ اندازہ لگائیں کہ کیا ہم میں سے کوئی شخص اگر مشترک چیز استعمال کرے تو کیا اس کو اس بات کا اہتمام اور خیال ہوتا ہے؟ بلکہ ہم لوگ ویسے ہی گندہ چھوڑ دیتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ جو بعد میں آئے گا، وہ بھرے گا، وہ خود ہی نمٹ لے گا، وہ جانے، اس کا کام جانے۔

غیر مسلم قومیں کیوں ترقی کر رہی ہیں

خوب سمجھ لیجیے! یہ دنیا اسباب کی دنیا ہے، اگر یہ باتیں غیر مسلموں نے حاصل کر کے ان پر عمل کرنا شروع کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں ترقی دے دی۔ اگرچہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں، لیکن معاشرت کے وہ آداب جو ہمیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھائے تھے، ان آداب کو انہوں نے اختیار کر لیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ترقی دے دی۔ لہٰذا یہ اعتراض تو کر دیا کہ ہم مسلمان ہیں، کلمہ پڑھتے ہیں، ایمان کا اقرار کرتے ہیں، اس کے باوجود ہم دنیا میں ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ دوسرے غیر مسلم ہونے کے باوجود ترقی کر رہے ہیں، لیکن یہ نہیں دیکھا کہ اُن غیر مسلموں کا یہ حال ہے کہ وہ تجارت میں جھوٹ نہیں بولیں گے، امانت اور دیانت سے کام لیں گے، جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کی تجارت چمکا دی، لیکن مسلمانوں نے ان چیزوں کو چھوڑ دیا اور دین کو مسجد اور مدرسے تک محدود کر کے بیٹھ گئے۔ زندگی کی باقی چیزوں کو دین سے خارج کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اپنے دین سے بھی دور ہو گئے اور دنیا میں بھی

ذلیل وخوار ہوگئے۔ حالانکہ حضورِ اقدس ﷺ نے یہ سب تعلیمات ہمیں عطا فرمائیں تاکہ ہم ان کو اپنی زندگی کے اندر اپنائیں اور ان کو دین کا حصہ سمجھیں۔ بہرحال! بات یہاں سے چلی تھی کہ ''دو کھجوروں کو ایک ساتھ ملا کر نہ کھاؤ''، لیکن اس سے کتنے اہم اصول ہمارے لیے نکلتے ہیں اور یہ کتنی ہمہ گیر بات ہے، اللہ تعالیٰ ہمارے دلوں میں احساس اور ادراک پیدا فرمادے۔ آمین۔

ٹیک لگا کر کھانا خلافِ سنّت ہے

عن أبي جحيفة رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ:
''لَا آكُلُ مُتَّكِئًا''(۱)

حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں ٹیک لگا کر نہیں کھاتا۔

ایک دوسری حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ

''رأيت رسول الله ﷺ جالسا مقعيا يأكل تمرا.''(۲)

میں نے حضورِ اقدس ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ اس طرح بیٹھے ہوئے کھجور کھا رہے تھے کہ آپ ﷺ نے اپنے گھٹنے کھڑے کیے ہوئے تھے۔

(۱) صحیح البخاری ۷/۷۲ (۵۳۹۸-۵۳۹۹) وسنن ابی داود ۳/۳۴۸ (۳۷۶۹)۔
(۲) صحیح مسلم ۳/۱۶۱۶ (۲۰۴۴) وسنن ابی داود ۳/۳۴۸ (۳۷۷۱)۔ مذکورہ الفاظ علامہ نووی رحمہ اللہ کی کتاب ریاض الصالحین ص ۳۴۹ (۷۴۷) طبع موسسہ الرسالہ۔ کے ہیں جو علامہ نووی رحمہ اللہ نے بحوالہ مسلم نقل کیے ہیں۔ از مرتب۔

اکڑوں بیٹھ کر کھانا مسنون نہیں

کھانے کی نشست کے بارے میں لوگوں کے ذہن میں چند غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں ان کو دور کرنا ضروری ہے۔ حضورِ اقدس سرورِ دو عالم ﷺ کی احادیث کی روشنی میں کھانے کی مستحب اور بہتر نشست یہ ہے کہ آدمی اس طرح بیٹھ کر کھائے کہ اس نشست کے ذریعے کھانے کی تعظیم بھی ہو، اور تواضع بھی ہو، متکبرانہ نشست نہ ہو اور اس نشست میں کھانے کی بے توقیری اور بے عزتی نہ ہو۔ یہ جو مشہور ہے کہ حضورِ اقدس سرورِ دو عالم ﷺ اکڑوں بیٹھ کر کھانا کھایا کرتے تھے، بات اس طرح درست نہیں۔ مجھے ایسی کوئی حدیث نہیں ملی جس میں حضورِ اقدس ﷺ کا اکڑوں بیٹھ کر کھانا ثابت ہو، البتہ جو اوپر حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس میں جس نشست کا ذکر کیا گیا ہے، وہ یہ کہ آپ ﷺ نے زمین پر بیٹھ کر اپنے دونوں گھٹنے سامنے کی طرف کھڑے کر دیے تھے۔ اس حدیث میں ''اکڑوں'' بیٹھنا مراد نہیں، لہٰذا یہ مشہور ہے کہ کھانے کے وقت آنحضرت ﷺ کی نشست تواضع والی نشست ہوتی تھی، جس میں دیکھنے والے کو فرعونیت یا تکبر یا رعونت کا احساس نہ ہو، بلکہ عبدیت کا احساس ہوتا ہو۔

کھانے کی بہترین نشست

ایک صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں پہنچا تو میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ اس طرح کھانا کھا رہے تھے،

جس طرح غلام کھانا کھاتا ہے[1]۔ بہر حال! احادیث کے مجموعے سے فقہاء کرام نے جو بات اخذ کی ہے وہ یہ ہے کہ کھانے کی بہتر نشست یہ ہے کہ آدمی یا دو زانوں بیٹھ کر کھائے۔ اس لیے کہ اس میں تواضع بھی زیادہ ہے اور کھانے کا احترام بھی ہے اور اس نشست میں بسیار خوری کا سد باب بھی ہے، اس لیے جب آدمی خوب پھیل کر بیٹھے گا تو زیادہ کھایا جائے گا اور ہمارے بزرگوں نے فرمایا کہ ایک ٹانگ اٹھا کر اور ایک ٹانگ بچھا کر کھانا بھی اسی فائدے میں داخل ہے اور یہ بھی تواضع والی نشست ہے اور اس طرح بیٹھ کر کھانے میں دنیا کا بھی فائدہ ہے اور آخرت کا بھی فائدہ ہے۔

چار زانوں بیٹھ کر کھانا بھی جائز ہے

کھانے کے وقت چار زانوں ہو کر بیٹھنا بھی جائز ہے، ناجائز نہیں۔ اس

(۱) اس طرح کی روایت مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں ملاحظہ ہو:

(أ) حدیث عائشة رضی اللہ عنہا مسند ابی یعلی ۳۱۸/۸ (٤٩٢٠) طبع دار للمامون للتراث۔ وقال الهيثمي في "مجمع الزوائد" ٥٨٢/٨ (١٤٢١٠): رواه أبو يعلى، وإسناده حسن۔ (طبع دار الفكر).

(ب) حدیث ابی هريرة رضی اللہ عنہ مسند البزار ٣٣/١ (٩٥٤٦) طبع مكتبة العلوم. للدينة المنورة. وقال الهيثمي في "المجمع" ٢١/٥ (٧٩١٦): رواه البزار، وفيه عبد الله بن رشيد، ومجاعة أبو عبيدة البصري، ولم أعرفهما، وبقية رجاله ثقات

(ج) حديث عبد الله بن عمر رضی اللہ عنہما مسند البزار ١٥٤/١٢ (٥٧٥٢) وقال الهيثمي في "المجمع" ٥٨٦/٨ (١٤٢٣٦): رواه البزار، وفيه حفص بن عمارة الطلحي ولم أعرفه، وبقية رجاله وثقوا.

(د) حديث ابی امامة رضی اللہ عنہ للمعجم الكبير ٢٠٠/٨ (٧٨١٢)۔ وقال الهيثمي في "المجمع" ٥٨٧/٨ (١٤٢٣٧): إسناده ضعيف۔

میں کوئی گناہ نہیں، لیکن یہ نشست تواضع کے اتنے قریب نہیں ہے، جتنی پہلی دو نشستیں قریب ہیں، لہٰذا عادت تو اس بات کی ڈالنی چاہیے کہ آدمی دوزانوں بیٹھ کر کھائے یا ایک ٹانگ کھڑی کر کے کھائے، چار زانوں بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے تو یہ کوئی گناہ نہیں۔ یہ جو لوگوں میں مشہور ہے کہ چار زانوں بیٹھ کر کھانا ناجائز ہے، یہ خیال درست نہیں، غلط ہے، البتہ افضل یہ ہے کہ دوزانوں بیٹھ کر کھائے۔ اس لیے کہ اس نشست میں کھانے کی عظمت اور توقیر زیادہ ہے۔

میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا

میز کرسی پر کھانا بھی کوئی گناہ اور ناجائز نہیں، لیکن زمین پر بیٹھ کر کھانے میں سنّت کی اتباع کا ثواب بھی ہے اور سنّت سے زیادہ قریب ہے۔ اس لیے حتی الامکان انسان کو اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ زمین پر بیٹھ کر کھائے، اس لیے کہ جتنا سنّت سے زیادہ قریب ہوگا، اتنی ہی برکت زیادہ ہوگی اور اتنا ہی ثواب زیادہ ملے گا۔ اتنے ہی فوائد زیادہ حاصل ہوں گے۔ بہرحال! میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا بھی جائز ہے، گناہ نہیں ہے۔

زمین پر بیٹھ کر کھانا سنّت ہے

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم دو وجہ سے زمین پر بیٹھ کر کھاتے تھے، ایک تو یہ کہ اس زمانے میں زندگی سادہ تھی، میز کرسی کا رواج ہی نہیں تھا۔ اس لیے نیچے بیٹھا کرتے تھے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ نیچے بیٹھ کر کھانے میں تواضع زیادہ ہے اور کھانے کی توقیر بھی زیادہ ہے۔ آپ اس کا تجزیہ کر کے دیکھ لیجیے کہ کرسی پر بیٹھ کر

کھانے میں دل کی کیفیت اور ہوگی اور زمین پر بیٹھ کر کھانے میں دل کی کیفیت اور ہوگی، دونوں میں زمین آسمان کا فرق محسوس ہوگا۔ اس لیے کہ زمین پر بیٹھ کر کھانے کی صورت میں طبیعت کے اندر تواضع زیادہ ہوگی، عاجزی زیادہ ہوگی، مسکنت ہوگی، عبدیت ہوگی اور میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے کی صورت میں یہ باتیں پیدا نہیں ہوتیں، اس لیے حتی الامکان اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ آدمی زمین پر بیٹھ کر کھائے، لیکن اگر کہیں میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے کا موقع آجائے، تو اس طرح کھانے میں کوئی حرج اور گناہ بھی نہیں ہے، لہٰذا اس پر اتنا تشدد کرنا بھی ٹھیک نہیں جیسا کہ بعض لوگ میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے کو حرام اور ناجائز ہی سمجھتے ہیں، اس پر بہت زیادہ نکیر کرتے ہیں، یہ عمل بھی درست نہیں۔

بشرطیکہ اس سنّت کا مذاق نہ اڑایا جائے

اور یہ جو میں نے کہا کہ زمین پر بیٹھ کر کھانا سنّت سے زیادہ قریب ہے اور زیادہ افضل ہے اور زیادہ ثواب کا باعث ہے، یہ بھی اس وقت ہے جب اس سنّت کو ''معاذ اللہ'' مذاق نہ بنایا جائے، لہٰذا اگر کسی جگہ پر اس بات کا اندیشہ ہو کہ اگر نیچے زمین پر بیٹھ کر کھانا کھایا گیا تو لوگ اس سنّت کا مذاق اڑائیں گے تو ایسی جگہ زمین پر کھانے پر اصرار کرنا بھی درست نہیں۔

حضرت والد صاحب رحمہ اللہ نے ایک دن سبق میں ہمیں ایک واقعہ سنایا کہ ایک دن میں اور میرے کچھ رفقاء دیوبند سے دہلی گئے، جب دہلی پہنچے تو وہاں کھانا کھانے کی ضرورت پیش آئی چونکہ اور کوئی جگہ کھانے کی نہیں تھی، اس لیے ایک ہوٹل میں کھانے کے لیے چلے گئے۔ اب ظاہر ہے کہ ہوٹل میں میز کرسی پر

کھانے کا انتظام ہوتا ہے۔ اس لیے ہمارے دو ساتھیوں نے کہا ہم تو کرسی پر بیٹھ کر نہیں کھائیں گے، اس لیے کہ زمین پر بیٹھ کر کھانا سنّت ہے۔ چنانچہ انہوں نے یہ چاہا کہ ہوٹل کے اندر زمین پر اپنا رومال بچھا کر وہاں بیرے سے کھانا منگوائیں، حضرت والد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ان کو منع کیا کہ ایسا نہ کریں، بلکہ میز کرسی پر ہی بیٹھ کر کھانا کھالیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم میز کرسی پر کیوں کھائیں؟ جب زمین پر بیٹھ کر کھانا سنّت کے زیادہ قریب ہے۔ تو پھر زمین پر بیٹھ کر کھانے سے کیوں ڈریں اور کیوں شرمائیں؟ حضرت والد صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ شرمانے اور ڈرنے کی بات نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ جب تم لوگ یہاں اس طرح زمین پر اپنا رومال بچھا کر بیٹھو گے، تو لوگوں کے سامنے اس سنّت کا تم مذاق بناؤ گے اور لوگ اس سنّت کی توہین کے مرتکب ہوں گے، اور سنّت کی توہین کا ارتکاب صرف گناہ ہی نہیں، بلکہ بعض اوقات انسان کو کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بچائے۔ آمین۔

ایک سبق آموز واقعہ

پھر حضرت والد صاحب رحمہ اللہ نے ان سے فرمایا کہ تم کو ایک قصہ سناتا ہوں۔ ایک بہت بڑے محدث اور بزرگ گزرے ہیں، جو ''سلیمان اعمش رحمۃ اللہ علیہ'' کے نام سے مشہور ہیں۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے بھی استاذ ہیں۔ تمام احادیث کی کتابیں ان کی روایتوں سے بھری ہوئی ہیں، عربی زبان میں ''اعمش'' چوندھے کو کہا جاتا ہے۔ جس کی آنکھوں میں چندھیاہٹ ہو، جس کی پلکیں گر جاتی ہیں اور روشنی کی وجہ سے اس کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں، چونکہ ان کی آنکھیں چندھائی ہوئی تھیں۔ اس وجہ سے ''اعمش'' لقب سے مشہور تھے۔ ان کے استاذ

ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ، جو اعرج، یعنی لنگڑے تھے، پاؤں سے معذور تھے اور یہ شاگرد بھی ایسے تھے جو ہر وقت استاذ سے چمٹے رہنے والے تھے، جیسے بعض شاگردوں کی عادت ہوتی ہے کہ ہر وقت استاذ سے چمٹے رہتے ہیں۔ جہاں استاذ جارہے ہیں، وہاں شاگرد بھی ساتھ ساتھ جارہے ہیں۔ یہ بھی ایسے تھے، چنانچہ امام نخعی رحمہ اللہ جب بازار جاتے تو یہ امام ''اعمش'' شاگرد بھی ساتھ ہوجاتے تھے، بازار میں لوگ ان پر فقرے کستے کہ دیکھو استاذ ''لنگڑا'' ہے اور شاگرد ''چوندھا''۔ چنانچہ امام نخعی رحمہ اللہ نے اپنے شاگرد سے فرمایا کہ جب ہم بازار جایا کریں تو تم ہمارے ساتھ مت جایا کرو، شاگرد نے کہا کیوں؟ میں آپ کا ساتھ کیوں چھوڑوں؟ امام نخعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ جب ہم بازار جاتے ہیں تو لوگ ہمارا مذاق اڑاتے ہیں کہ استاذ لنگڑا ہے اور شاگرد چوندھا ہے۔ شاگرد نے کہا:

''مالنانؤجرویأثمون''

حضرت! جو لوگ مذاق اڑاتے ہیں، ان کو مذاق اڑانے دیں، اس لیے اس مذاق اڑانے کے نتیجے میں ہمیں ثواب ملتا ہے اور ان کو گناہ ہوتا ہے۔ اس میں ہمارا تو کوئی نقصان نہیں، بلکہ ہمارا تو فائدہ ہے، حضرت امام نخعی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا کہ

''نسلم ویسلمون خیر من أن نؤجر ویأثمون''

ارے بھائی! وہ بھی گناہ سے بچ جائیں اور ہم بھی گناہ سے بچ جائیں، یہ اس کی بنسبت بہتر ہے کہ ہمیں ثواب ملے اور ان کو گناہ ہو۔ میرے ساتھ جانا کوئی فرض و واجب تو ہے نہیں اور نہ جانے میں کوئی نقصان تو ہے نہیں، البتہ

فائدہ یہ ہے کہ لوگ اس گناہ سے بچ جائیں گے۔ لہٰذا ہمارے مسلمان بھائیوں کو گناہ ہو۔ اس سے بہتر یہ صورت ہے کہ نہ ان کو گناہ ہو اور نہ ہمیں گناہ ہو۔ اس لیے آئندہ میرے ساتھ بازار مت جایا کرو[1]۔

اس وقت مذاق کی پرواہ نہ کرے

لیکن یہ بات یاد رکھو! اگر کوئی گناہ کا کام ہے، تو پھر چاہے کوئی مذاق اڑائے یا ہنسی اڑائے اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ لوگوں کے مذاق اڑانے کی وجہ سے گناہ کا کام کرنا جائز نہیں۔ لوگوں کے مذاق اڑانے کی وجہ سے کوئی فرض یا واجب کام چھوڑنا جائز نہیں، لیکن اگر ایک طرف جائز اور مباح کام ہے اور دوسری طرف اولیٰ اور افضل کام ہے۔ اب اگر لوگوں کو گناہ سے بچانے کے لیے افضل کام چھوڑ دو اور اس کے مقابلے میں جو جائز کام ہے۔ اس کو اختیار کر لو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، ایسا کرنا درست ہے۔

بلا ضرورت میز کرسی پر نہ کھائے

چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک مرتبہ میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھانے کی ضرورت پیش آ گئی، تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس وقت فرمایا کہ ویسے تو میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا ناجائز تو نہیں ہے، لیکن اس میں تھوڑا سا تشبّہ کا شبہ ہے کہ چونکہ انگریزوں کا چلایا ہوا طریقہ ہے، اس طرح کھانے میں ان کے ساتھ مشابہت نہ ہو جائے۔ اس لیے جب آپ کرسی پر بیٹھے تو پاؤں اٹھا کر بیٹھ گئے،

(۱) المنتظم فی تاریخ الملوک والامم لابن الجوزی ۲۱/۷ طبع دار الکتب العلمیة۔

پاؤں لٹکائے نہیں اور پھر فرمایا کہ انگریزوں کے ساتھ مشابہت پیدا ہوجانے کا جو شبہ تھا، وہ اس طرح بیٹھنے سے ختم ہوگیا۔ اس لیے کہ وہ لوگ پاؤں لٹکا کر کھاتے ہیں، میں نے پاؤں اوپر کر لیے ہیں۔

بہر حال! میز کرسی پر کھانا ناجائز اور گناہ نہیں، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ آدمی جتنا سنّت سے قریب ہوگا اتنی ہی برکت زیادہ ہوگی، اتنا ہی اجر زیادہ ملے گا، لہٰذا بلا وجہ اور بلا ضرورت میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے کو اپنی عادت بنالینا اچھا نہیں، بہتر یہ ہے کہ زمین پر بیٹھ کر کھانے کا اہتمام کرے، لیکن جہاں کہیں ضرورت داعی ہو۔ وہاں میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھایا جاسکتا ہے۔ البتہ اس بات کا اہتمام کرے کہ پیچھے ٹیک لگا کر نہ کھائے، بلکہ آگے کی طرف جھک کر کھائے، اس لیے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹیک لگا کر کھانے کو متکبرین کا طریقہ قرار دیا ہے۔ یہ طریقہ درست نہیں۔

چارپائی پر کھانا

اسی طرح چار پائی پر بیٹھ کر کھانا بھی جائز ہے، بلکہ کرسی پر کھانے کے مقابلے میں چار پائی پر کھانا زیادہ بہتر ہے، اس لیے کہ وہ طریقہ جس میں کھانے والا اور کھانے کی سطح برابر ہو۔ اس سے بہتر ہے جس میں کھانا اوپر ہو اور کھانے والا نیچے ہو۔ البتہ سب سے بہتر یہ ہے کہ زمین پر بیٹھ کر کھایا جائے، اس میں ثواب بھی زیادہ ہے۔ تواضع بھی اس سے زیادہ ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت سے بھی زیادہ قریب ہے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں سنتوں سے زیادہ قریب رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

کھانے کے وقت باتیں کرنا

ایک غلط بات لوگوں میں مشہور ہے کہ کھانا کھاتے وقت باتیں کرنا جائز نہیں، یہ بھی بے اصل بات ہے، شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں، کھانا کھانے کے دوران ضرورت کی بات کی جاسکتی ہے اور حضورِ اقدس ﷺ سے ثابت بھی ہے، البتہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ

> ''اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ کھانے کے وقت جو باتیں کی جائیں وہ ہلکی پھلکی ہوں، زیادہ سوچ و بچار اور زیادہ انہماک کی باتیں کھانے کے وقت نہیں کرنی چاہیے، اس لیے کہ کھانے کا بھی حق ہے۔''

وہ حق یہ ہے کہ کھانے کی طرف متوجہ ہوکر کھانا چاہیے، لہٰذا ایسی باتیں کرنا جس میں انسان منہمک ہوجائے اور کھانے کی طرف توجہ نہ رہے، ایسی باتیں کرنا درست نہیں۔ خوش طبعی اور ہنسی مذاق کی ہلکی پھلکی باتیں کرسکتے ہیں، لیکن یہ جو مشہور ہے کہ آدمی کھانے کے وقت بالکل خاموش رہے کوئی بات نہ کرے، یہ درست نہیں۔

کھانے کے بعد ہاتھ پونچھ لینا جائز ہے

> ''عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: قال رسول الله ﷺ: «إذا اكل احدكم طعاماً فلا يمسح اصابعه حتىٰ يَلْعَقها أو يُلعِقها»''(۱)

(۱) صحیح البخاری ۸۲/۷ (۵۴۵۶) و صحیح مسلم ۱۶۰۵/۳ (۲۰۳۱)۔ مذکورہ الفاظ ریاض الصالحین ص ۲۴۹ (۷۴۸) کے ہیں۔ از مرتب

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھاچکے تو اپنی انگلیوں کو صاف نہ کرے۔ جب تک خود ان کو چاٹ نہ لے یا دوسرے کو نہ چٹوادے۔

علماءِ کرام نے فرمایا کہ اس حدیث سے دو مسئلے نکلتے ہیں اور دو ادب اس حدیث میں بیان کیے گئے ہیں۔ پہلا مسئلہ اس سے یہ نکلتا ہے کہ کھانا کھانے کے بعد جس طرح ہاتھ دھونا جائز، بلکہ مستحب ہے اور سنّت ہے۔ اسی طرح ان ہاتھوں کو کسی چیز سے پونچھ لینا بھی جائز ہے۔ البتہ افضل تو یہ ہے کہ ہاتھوں کو پانی سے دھولیا جائے، لیکن اگر پانی موجود نہیں ہے یا پانی استعمال کرنے میں کوئی تکلیف اور دشواری ہے، تو اس صورت میں کسی کاغذ یا کپڑے سے پونچھ لینا بھی جائز ہے، جیسا کہ آج کل ٹیشو پیپر اسی مقصد کے لیے ایجاد ہوگئے، ان سے ہاتھ پونچھ لینا بھی جائز ہے۔

کھانے کے بعد انگلیاں چاٹ لینا سنّت ہے

دوسرا مسئلہ جو اس حدیث کے بیان کا اصل مقصود ہے۔ وہ یہ کہ ہاتھوں کو دھونے اور پونچھنے سے پہلے انگلیوں کو چاٹ لینا چاہیے اور خود حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ معمول تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنّت تھی کہ کھانے کے جو ذرّات انگلیوں پر لگے رہ جاتے، آپ انہیں چاٹ لیتے تھے[1] اور اس کی حکمت حضورِ اقدس سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دوسری حدیث میں یہ بیان فرمائی کہ تمہیں نہیں

(۱) صحیح مسلم ۱۶۰۵/۳ (۲۰۳۲) وسنن ابی داود ۳۶۶/۳ (۳۸۴۸)۔

معلوم کہ کھانے کے کون سے حصے میں برکت ہے[1]۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کھانے کے اس مخصوص جزء میں برکت ہو، جو تمہاری انگلیوں پر لگا رہ گیا ہے، لہٰذا اس حصے کو بھی ضائع نہ کرو، بلکہ اس کو بھی کھالو، تاکہ اس برکت سے محروم نہ رہو۔

برکت کیا چیز ہے؟

یہ برکت کیا چیز ہے؟ آج کی دنیا مادہ پرستی میں گھری ہوئی ہے، صبح سے لے کر شام تک مادہ ہی چکر کاٹتا نظر آتا ہے اور مادے کے پیچھے، مال و دولت اور سامان و اسباب کے پیچھے جھانکنے کی صلاحیت ہی ختم ہوگئی ہے۔ اس لیے آج کل برکت کا مفہوم سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ برکت کیا چیز ہے؟ برکت ایک ایسا وسیع مفہوم ہے۔ جس میں دنیا و آخرت کی تمام صلاح و فلاح سب شامل ہوجاتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک عطا ہوتی ہے، جس کا آپ نے اپنی زندگی میں بارہا مشاہدہ کیا ہوگا۔ مثلاً کہ بعض اوقات انسان کسی چیز کے بے شمار اسباب جمع کرلیتا ہے۔ مگر ان سے فائدہ نہیں ہوتا، مثلاً اپنے گھر کے اندر آرام و راحت کے تمام اسباب جمع کرلیے، اعلیٰ سے اعلیٰ فرنیچر سے گھر کو سجادیا۔ بہترین بیڈ لگالیے، حشم و خدم، نوکر چاکر سب جمع کرلیے، سجاوٹ کا سارا سامان جمع کرلیا، لیکن اس کے باوجود رات کو نیند نہیں آتی، ساری رات بستر پر کروٹیں بدلتے رہے۔ معلوم ہوا کہ ساز و سامان میں برکت نہیں اور اس سامان سے جو فائدہ حاصل ہونا چاہیے تھا وہ حاصل نہیں ہوا۔ اب بتاؤ کہ کیا یہ ساز و سامان اپنی ذات میں خود مقصود ہیں

(۱) صحیح مسلم ۱۶۰۶/۳ (۲۰۳۳) ومسند الحمیدی ۳۲۵/۲ (۱۲۷۰) طبع دار السقاء۔ دمشق۔

کہ ان کو دیکھتے رہو؟ اور خوش ہوتے رہو، ارے یہ سامان تو اس لیے ہے کہ اس کے ذریعے راحت ملے، آرام ملے، سکون حاصل ہو، یاد رکھو! یہ ساز و سامان اگرچہ راحت اور سکون کا ذریعہ تو ہیں، لیکن جس چیز کا نام ''راحت اور سکون'' ہے، وہ خالص اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، لہٰذا جب اللہ تعالیٰ عطا فرمائیں گے تب ''راحت و آرام'' حاصل ہوگا۔ ورنہ دنیا کا کتنا بھی اسباب و سامان جمع کرلو، مگر راحت اور آرام نہیں ملے گا۔

اسباب میں راحت نہیں

آج ہر شخص اپنے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھ لے کہ آج سے تیس چالیس سال پہلے ہر شخص کے پاس کیسا ساز و سامان تھا اور آج کتنا ہے اور کیسا ہے؟ جائزہ لینے سے یہی نظر آئے گا کہ بیشتر افراد وہ ہیں جن کی معاشی حالت میں ترقی ہوئی ہے، ان کے گھر کے ساز و سامان میں اضافہ ہوا ہے، فرنیچر پہلے سے اچھا ہے، گھر پہلے سے اچھا بن گیا ہے، آرام دہ چیزیں پہلے سے زیادہ حاصل ہوگئیں، لیکن یہ دیکھو کہ کیا سکون بھی حاصل ہوا؟ کیا راحت و آرام ملا؟ اگر سکون و آرام نہیں ملا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس سامان میں اللہ تعالیٰ سے برکت حاصل نہیں ہوئی۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ فلاں چیز میں برکت ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس چیز کے استعمال سے جو فائدہ حاصل ہونا چاہیے تھا، وہ حاصل ہو رہا ہے۔ اور بے برکتی یہ ہے کہ اس چیز کے استعمال کے باوجود راحت اور آرام حاصل نہیں ہو رہا ہے۔

راحت اللہ تعالیٰ کی عطا ہے

یاد رکھو! راحت، آرام، سکون یہ چیزیں بازار سے پیسوں کے ذریعے نہیں خریدی جاسکتیں، یہ خالص اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، وہی عطا فرماتے ہیں، اسی کا نام برکت ہے۔ جن لوگوں کے پیسوں میں برکت ہوتی ہے، گنتی کے اعتبار سے تمہارے مقابلے میں ان کے پاس شاید پیسے کم ہوں، لیکن پیسوں کا جو فائدہ ہے؛ یعنی راحت وآرام، وہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دے رکھا ہے۔

مثلاً ایک دولت مند انسان ہے، اس کے پاس دنیا کا سارا ساز وسامان جمع ہے، کارخانے ہیں، کاریں کھڑی ہیں، فرنیچر ہے، نوکر چاکر ہیں، جب کھانا چنا جاتا ہے تو دسترخوان پر اعلیٰ سے اعلیٰ کھانے موجود ہیں، لیکن معدہ خراب ہے، بھوک نہیں لگتی، ڈاکٹر نے منع کیا ہے کہ فلاں چیز نہیں کھاسکتے فلاں چیز نہیں کھاسکتے، اب نعمتوں کے موجود ہونے کے باوجود ان سے فائدہ حاصل نہیں ہورہا، اسی کا نام بے برکتی ہے۔

دوسری طرف ایک مزدور نے آٹھ گھنٹے محنت کر کے سو روپے کمائے اور پھر ہوٹل سے دال روٹی یا سبزی روٹی خریدی اور پھر بھوک کے بعد خوب پیٹ بھر کر کھایا، کھانے کی پوری لذت حاصل کی اور جب رات کو اپنی ٹوٹی پھوٹی چارپائی پر سویا تو آٹھ گھنٹے کی بھرپور نیند لے کر اٹھا، جس سے معلوم ہوا کہ کھانے کی لذت اس مزدور کو حاصل ہوئی، نیند کی لذت بھی اس کو حاصل ہوئی۔ البتہ اتنی بات ہے کہ دولت مند جیسا ٹیپ ٹاپ اس کے پاس نہیں ہے۔ یہ ہے برکت کہ اللہ تعالیٰ نے تھوڑی سی چیز میں برکت ڈال دی اور جن چیزوں سے جو فائدہ حاصل ہونا تھا۔ وہ اُس سے حاصل کرلیا۔

کھانے میں برکت کا مطلب

دیکھیے! جو کھانا آپ کھا رہے ہیں، یہ کھانا بذاتِ خود مقصود نہیں، بلکہ کھانے کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے قوت حاصل ہو، جسم کو تقویت ملے، کھانے سے مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے بھوک مٹ جائے اور وہ کھانا جزوِ بدن بن جائے، اس کے ذریعے لذت اور راحت حاصل ہو، لیکن کھانے کے ذریعے ان تمام چیزوں کا حاصل ہونا، یہ محض اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ اس بات کو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس حدیث میں بیان فرما رہے ہیں کہ ''تمہیں کیا معلوم کہ کھانے کے کس جزء میں اللہ تعالیٰ نے برکت رکھی ہے،'' ہوسکتا ہے جو کھانا تم کھا چکے ہو، اس میں برکت نہ ہو اور انگلیوں پر کھانے کا جو حصہ لگا ہوا تھا۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے برکت رکھی تھی، تم نے اس کو چھوڑ دیا۔ جس کے نتیجے میں تم برکت سے محروم رہ گئے۔ چنانچہ وہ کھانا تو تم نے کھالیا، لیکن وہ کھانا نہ تو جزوِ بدن بنا، بلکہ اس کھانے نے بدہضمی پیدا کردی اور صحت کو نقصان پہنچا دیا اور اس سے جو قوت حاصل ہونی تھی، وہ حاصل نہ ہوئی۔

کھانے کے باطن پر اثرات

یہ تو میں ظاہری سطح کی باتیں کر رہا ہوں، ورنہ اللہ تبارک و تعالیٰ جن لوگوں کو ''دیدۂ بینا'' یعنی بصیرت کی آنکھ عطا فرماتے ہیں وہ اس سے بھی آگے پہنچتے ہیں، وہ یہ کہ کھانے کھانے میں فرق ہے۔ یہ کھانا انسان کی فکر پر، اس کی سوچ پر، اس کے جذبات اور خیالات پر اثر انداز ہوتا ہے، بعض کھانے وہ ہوتے ہیں جو انسان کے باطنی حالات میں ظلمت اور تاریکی پیدا کرتے ہیں۔ گناہوں کا

شوق اور خراب داعیے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور بعض کھانے ایسی برکت والے ہوتے ہیں کہ جس کی وجہ سے باطن کو سرور حاصل ہوتا ہے، روح کو غذا ملتی ہے، اچھے ارادے اور اچھے خیالات دل میں آتے ہیں، جس کی وجہ سے انسان کو نیکیوں کی ترغیب ہوتی ہے، نیکیوں کا داعیہ دل میں ابھرتا ہے، لیکن چونکہ ہماری آنکھیں اس مادہ پرستی کے دور میں اندھی ہوچکی ہیں، ہم لوگ بصیرت کھو چکے ہیں، جس کی وجہ سے کھانے کی ظلمت اور نورانیت کا فرق نہیں پتہ چلتا۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ بصیرت کی آنکھ عطا فرماتے ہیں۔ ان سے پوچھیے۔

کھانے کے اثرات کا واقعہ

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمہ اللہ جو دارالعلوم دیو بند کے صدر مدرس اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے استاذ تھے، غالباً انہی کا واقعہ ہے کہ ایک شخص نے ایک مرتبہ حضرت والا کی دعوت کی۔ آپ وہاں تشریف لے گئے، کھانا شروع کیا، ایک نوالہ کھانے کے بعد معلوم ہوا کہ جس شخص نے دعوت کی ہے۔ اس کی آمدنی حلال نہیں ہے، اس کی وجہ سے یہ کھانا حلال نہیں ہے، چنانچہ کھانا چھوڑ کر کھڑے ہوگئے اور واپس چلے آئے، لیکن ایک نوالہ جو حلق سے نیچے اتار لیا تھا۔ اس کی ظلمت اور تاریکی دو ماہ تک انہیں محسوس ہوتی رہی۔ وہ اس طرح کے دو ماہ تک ان کے دل میں گناہ کرنے کے داعیے بار بار پیدا ہوتے رہے۔ دل میں یہ تقاضا ہوتا کہ فلاں گناہ کرلوں، فلاں گناہ کرلوں۔ اب بظاہر تو اس میں کوئی جوڑ نظر نہیں آتا کہ ایک لقمہ کھالینے میں اور گناہ کا تقاضہ پیدا ہونے میں کیا جوڑ ہے؟

لیکن بات دراصل یہ ہے کہ ہمیں اس لیے محسوس نہیں ہوتا کہ ہمارا سینہ

ظلمت کے داغوں سے بھرا ہوا ہے۔ جیسے ایک سفید کپڑے کے اوپر بے شمار سیاہ داغ لگے ہوئے ہوں، اس کے بعد ایک داغ اور لگ جائے، پتہ بھی نہیں چلے گا کہ نیا داغ کون سا ہے؟ لیکن اگر کپڑا سفید، صاف شفاف ہو، اس پر اگر ایک داغ بھی لگ جائے تو دور سے نظر آئے گا کہ داغ لگا ہوا ہے۔ بالکل اسی طرح ان اللہ والوں کے دل آئینے کی طرح صاف شفاف ہوتے ہیں، اس پر اگر ایک داغ بھی لگ جائے تو وہ بھی محسوس ہوتا ہے، اس کی ظلمت نظر آتی ہے، چنانچہ ان اللہ کے بندے نے یہ محسوس کرلیا کہ اس ایک لقمے کے کھانے سے پہلے تو نیکی کے داعیے بھی دل میں پیدا ہورہے ہیں گناہوں سے نفرت ہے، لیکن ایک لقمہ کھانے کے بعد دل میں گناہوں کے تقاضے پیدا ہونے لگے، اس لیے بعد میں فرمایا کہ درحقیقت یہ اس ایک خراب لقمے کی ظلمت تھی۔ اس کا نام "برکت باطنی" ہے، جب اللہ تعالیٰ یہ برکت باطنی عطا فرمادیتے ہیں تو پھر اس کے ذریعے انسان کے باطن میں ترقی ہوتی ہے، اخلاق اور خیالات درست ہوجاتے ہیں۔

ہم مادہ پرستی میں پھنسے ہوئے ہیں

آج ہم مادہ پرستی میں اور پیسوں کی گنتی میں پھنس گئے، ساز و سامان اور ٹیپ ٹاپ میں پھنس گئے، جس کے نتیجے میں ہر کام کی باطنی روح ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئی اور یہ باتیں اچھنبی معلوم ہوتی ہیں، اس لیے برکت کا مطلب بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر کوئی ہزار بار کہے کہ فلاں کام میں برکت ہے تو اس کی اہمیت دل میں پیدا نہیں ہوتی، لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ کھانا کھاؤ گے تو ایک ہزار روپے زیادہ ملیں گے تو اب طبیعت میں اس کھانے کی طرف رغبت پیدا

ہوگی کہ ہاں! یہ فائدے کا کام ہے اور اگر کوئی کہے کہ فلاں طریقے سے کھاؤ گے تو اس کھانے میں برکت ہوگی تو اس طریقے کی طرف رغبت نہیں ہوگی، اس لیے کہ یہ پتہ ہی نہیں کہ برکت کیا ہوتی ہے؟ اس برکت کا ذہن میں تصور ہی نہیں ہے، حالانکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جگہ جگہ احادیث میں فرمادیا کہ اس عمل سے برکت حاصل ہوگی اور اس عمل سے برکت سلب ہوجائے گی، برکت حاصل کرنے کی کوشش کرو، بے برکتی سے بچو۔ اس لیے یہ بات یاد رکھو کہ یہ برکت اس وقت تک حاصل نہیں ہوگی جب تک حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کا اتباع نہیں ہوگا، چنانچہ اس حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں کہ کھانے کے بعد انگلیاں چاٹ لو، اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ کھانے کے جوذرات انگلیوں میں لگے ہوئے ہیں ان میں برکت ہو۔

کیا انگلیاں چاٹ لینا شائستگی کے خلاف ہے؟

آج فیشن پرستی کا زمانہ ہے۔ لوگوں نے اپنے لیے نئے نئے ایٹیکیٹس (atticates) بنارکھے ہیں، چنانچہ اگر دسترخوان پر سب کے ساتھ کھانا کھارہے ہیں، اس وقت اگر انگلیوں پر لگے ہوئے سالن کو چاٹ لیں، تو یہ شائستگی کے خلاف ہے، تہذیب کے خلاف ہے، یہ تو ناشائستگی اور بدتہذیبی ہے، اس لیے اس کام کو کرتے ہوئے شرم آتی ہے، اگر لوگوں کے سامنے کریں تو لوگ ہنسی مذاق اڑائیں گے اور کہیں گے کہ یہ شخص غیر مہذب اور ناشائستہ ہے۔

تہذیب اور شائستگی سنتوں پر منحصر ہے

لیکن یاد رکھو! ساری تہذیب اور ساری شائستگی حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر منحصر ہے، جس چیز کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شائستگی قرار دے دیا۔ وہ ہے شائستگی، یہ نہیں ہے کہ جس چیز کو فیشن نے شائستگی قرار دے دیا، وہ شائستگی ہو، اس لیے یہ فیشن تو روز بدلتے ہیں۔ کل تک جو چیز ناشائستہ تھی، آج وہ چیز شائستہ بن گئی۔

کھڑے ہو کر کھانا بدتہذیبی ہے

مثلاً کھڑے ہو کر کھانا آج کل فیشن بن گیا ہے، ایک ہاتھ میں پلیٹ پکڑی ہے، دوسرے ہاتھ سے کھانا کھا رہے ہیں، اسی پلیٹ میں سالن بھی ہے، اسی میں روٹی بھی ہے، اسی میں سلاد ہے اور جس وقت دعوت میں کھانا شروع ہوتا ہے اس وقت چھینا جھپٹی ہوتی ہے، اس میں کسی کو بھی ناشائستگی نظر نہیں آتی؟ اس لیے کہ فیشن نے آنکھیں اندھی کر دی ہیں، اس کے نتیجے میں اس کے اندر ناشائستگی نظر نہیں آتی۔ چنانچہ جب تک کھڑے ہو کر کھانے کا فیشن اور رواج نہیں چلا تھا اس وقت اگر کوئی شخص کھڑے ہو کر کھانا کھاتا تو ساری دنیا اس کو یہی کہتی کہ یہ غیر مہذب اور بڑا ناشائستہ طریقہ ہے، صحیح طریقہ تو یہ ہے کہ آدمی آرام سے بیٹھ کر کھائے۔

فیشن کو بنیاد مت بناؤ

لہٰذا فیشن کی بنیاد پر تو تہذیب اور شائستگی روز بدلتی ہے اور بدلنے والی چیز

کا کوئی بھروسہ اور کوئی اعتبار نہیں، اعتبار اس چیز کا ہے جس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنت قرار دے دیا اور جس کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتادیا کہ برکت اس میں ہے، اب اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی نیت سے یہ کام کرلو گے تو آخرت میں بھی اجروثواب اور دنیا میں بھی برکت حاصل ہوگی اور اگر معاذ اللہ! ناشائستہ سمجھ کر اس کو چھوڑ دو گے تو پھر تم اس کی برکتوں سے بھی محروم ہوجاؤ گے اور پھر یہ بے چینیاں تمہاری مقدر ہوں گی، محرومیاں تمہاری مقدر بن جائیں گی، گناہوں کی رغبت تمہارا مقدر ہوگی اور دن رات تمہارے دل میں ظلمت اور تاریکیاں پیدا ہوتی رہیں گی۔ بہر حال! بات لمبی ہوگئی، اس حدیث مبارک میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی تاکید فرمائی کہ کھانے کے بعد اپنی انگلیاں چاٹ لیا کرو تاکہ کھانے کی برکت حاصل ہوجائے۔

تین انگلیوں سے کھانا سنّت ہے

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عام عادت یہ تھی کہ آپ عموماً تین انگلیوں سے کھانا تناول فرمایا کرتے تھے [1] یعنی انگوٹھا، شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی، ان تینوں انگلیوں کو ملا کر نوالہ لیتے تھے، علماءِ کرام نے تین انگلیوں سے کھانے کی ایک حکمت تو یہ لکھی ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ سادہ غذاؤں کا زمانہ تھا، آج کل کی طرح بہت لمبے چوڑے کھانے نہیں ہوتے تھے اور دوسری حکمت یہ لکھی ہے کہ جب تین انگلیوں سے کھانا کھائیں گے تو نوالہ چھوٹا بنے گا اور چھوٹے نوالے میں ایک فائدہ طبّی طور پر یہ ہے کہ نوالہ جتنا چھوٹا ہوگا، اتنا ہی اس کے

---

(۱) صحیح مسلم ۱۶۰۵/۳ (۲۰۳۲) وسنن ابی داود ۳۶۶/۳ (۳۸۴۸)۔

ہضم ہونے میں آسانی ہوگی، اس لیے کہ بڑا نوالہ پوری طرح چبے گا نہیں اور معدے میں جا کر نقصان پہنچائے گا۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اگر بڑا نوالہ لیا جائے گا تو اس سے انسان کی حرص کا اظہار ہوتا ہے اور چھوٹے نوالے میں قناعت کا اظہار ہوتا ہے، اس لیے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تین انگلیوں سے تناول فرماتے تھے، اگرچہ کبھی کبھار چار انگلیوں سے بھی کھایا کرتے تھے (۱)، بلکہ ایک روایت میں ایک واقعہ آیا ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پانچ انگلیوں سے کھانا تناول فرمایا(۲)۔ جس کے ذریعے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتادیا کہ تین کے بجائے چار اور پانچ انگلیوں سے کھانا بھی جائز ہے، لیکن عام طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول اور آپ کی سنّت تین انگلیوں سے کھانے کی تھی۔

انگلیاں چاٹنے میں ترتیب

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا عشق دیکھیے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک ادا کو ہمارے لیے اس طرح محفوظ کر کے چھوڑ گئے ہیں کہ ہمارے لیے اس کی نقل

(۱) الفوائد الشهير بالغيلانيات لابی بكر الشافعی ۷۰۵/۲ (۹٦۱) طبع دار ابن الجوزی. وجامع المسانيد لابن كثير ٤۸۳/٤ (٥٦۱۹) معزوا الى الطبرانی-طبع دار خضر بيروت-وقال المناوی فی "فيض القدير"(۱۹٦/٥):(طب عن عامر بن ربيعة) قال الزين العراقي: ورويناه عنه في الغيلانيات، وفيه القاسم بن عبد الله العمري هالك، قال: وفي مصنف ابن أبي شيبة عن الزهري مرسلا: كان النبي ﷺ يأكل بالخمس، (طبع المكتبة التجارية الكبرى مصر)۔

(۲) مصنف ابن ابی شیبه ۳۹۲/۱۲ (۲٤۹٥۳) والحديث ذكره الحافظ ابن حجر فی "فتح الباری" ٥۷۸/۹ وعزاه الى ابن ابی شيبه وسعيد بن منصور وسكت عنه(طبع دار للمعرفة)

اتارنا اور اس کی اتباع آسان ہوجائے، چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے ہمیں یہ بتادیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کس ترتیب سے یہ تین انگلیاں چاٹا کرتے تھے، فرماتے ہیں کہ ان تین انگلیوں کو چاٹنے کی ترتیب یہ ہوتی تھی کہ پہلے بیچ کی انگلی، پھر شہادت کی انگلی اور پھر انگوٹھا(1)۔ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپس میں مل کر بیٹھتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کا تذکرہ کرتے اور ایک دوسرے کو ترغیب دیتے کہ ہمیں بھی اسی طرح کرنا چاہیے۔ اب اگر کوئی انگلیاں نہ چاٹے تو کوئی گناہ نہیں ہوگا، مگر سنّت کی برکت سے محروم ہوجائے گا۔

کب تک ہنسے جانے سے ڈروگے؟

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اگر ہم لوگوں کے سامنے انگلیاں چاٹیں گے تو لوگ اس پر ہنسی مذاق اڑائیں گے اور ہمیں غیر مہذب اور ناشائستہ کہیں گے، تو یاد رکھیے! جب تک ایک مرتبہ خم ٹھوک کر، کمر مضبوط کر کے اس بات کا تہیہ نہیں کرلوگے کہ دنیا کے لوگ جو کہیں، کہا کریں۔ ہمیں تو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت محبوب ہے، ہمیں تو اس پر عمل کرنا ہے۔ جب تک یہ فیصلہ نہیں کروگے یاد رکھو! یہ دنیا تمہاری ہنسی مذاق اڑاتی رہے گی۔ مغربی قوموں کی نقالی کرتے کرتے ہمارا یہ حال ہوگیا ہے کہ سر سے لے کر پاؤں تک اپنا سراپا ان کے سانچے میں ڈھال لیا، لباس پوشاک ان جیسا، رہن سہن ان جیسا، وضع قطع ان

(1) المعجم الاوسط للطبرانی ۱۸۰/۲ (۱٦٤۹) طبع دار الحرمین۔ وقال الهیثمی فی "مجمع الزوائد" ۲۹/۵ (۷۹٤۱): رواه الطبراني في "الأوسط"، وفيه الحسين بن إبراهيم الأذني ومحمد بن كعب بن عجرة، ولم أعرفهما، وبقية رجاله ثقات۔ واخلاق النبی لابی الشیخ ۲۲۷/۳ (٦٠٤)۔ طبع دار المسلم للنشر والتوزیع۔

جیسی، طریقے ان جیسے، تہذیب ان کی اختیار کرلی۔ ہر چیز میں ان کی نقالی کرکے دیکھ لی۔ اب یہ بتاؤ کہ کیا ان کی نظر میں تمہاری عزت ہوگئی؟ آج بھی وہ قوم تمہیں ذلت کی نگاہ سے دیکھتی ہے، تمہیں ذلیل سمجھتی ہے، روزانہ تمہاری پٹائی ہوتی ہے، تمہارے اوپر طمانچے لگتے ہیں، تمہیں حقیر سمجھا جاتا ہے، یہ سب کچھ اس لیے ہورہا ہے کہ تم نے ان کو خوش کرنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے چھوڑ کر ان کے طریقے اختیار کرلیے ہیں، چنانچہ وہ جانتے ہیں کہ یہ لوگ ہمارے مقلد اور ہمارے نقال ہیں، اب تم ان کے سامنے کتنے ہی بن سنور کر چلے جاؤ، لیکن تم دقیانوس اور فنڈامینٹلسٹ (Fundamenatlist) ہی رہو گے اور تمہارے اوپر یہی طعنہ لگے گا کہ یہ بنیاد پرست اور غیر مہذب ہیں، رجعت پسند ہیں۔

یہ طعنے انبیاء کی وراثت ہے

جب تک تم ایک مرتبہ کمر مضبوط کر کے یہ تہیہ نہیں کرلو گے کہ یہ لوگ طعنے دیتے ہیں تو دیا کریں، کیونکہ یہ طعنے تو حق کے راستے کے راہی کا زیور ہیں، جب انسان حق کے راستے پر چلتا ہے تو اس کو یہی طعنے ملا کرتے ہیں۔ ارے ہم کیا ہیں؟ ہمارے پیغمبروں کو یہی طعنے ملے چنانچہ قرآنِ کریم میں ہے کہ

وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ [1]

یہ کفار پیغمبروں سے کہا کرتے تھے کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ جو لوگ تمہاری

(۱) سورۃ ھود، آیت (۲۷)۔

اتباع کر رہے ہیں یہ بڑے ذلیل قسم کے لوگ ہیں، حقیر، ناشائستہ اور غیر مہذب لوگ ہیں۔ بہرحال! اگر تم مسلمان ہو، پیغمبروں کے امتی اور ان کے متبع ہو تو پھر جہاں اور چیزیں ان کی وراثت میں تمہیں حاصل ہوئی ہیں یہ طعنے بھی ان کی وراثت ہیں۔ آگے بڑھ کر ان طعنوں کو گلے لگاؤ اور اپنے لیے ان کو باعثِ فخر سمجھو کہ الحمد للہ! وہی طعنے جو انبیاء علیہم السلام کو دیے گئے تھے، ہمیں بھی دیے جا رہے ہیں یاد رکھو! جب تک یہ جذبہ پیدا نہیں ہوگا۔ اس وقت تک یہ ساری قومیں تمہارا مذاق اڑاتی رہیں گی۔ اسد ملتانی مرحوم شاعر گزرے ہیں، انہوں نے بڑا اچھا شعر کہا ہے کہ۔

ہنسے جانے سے جب تک تم ڈرو گے
زمانہ تم پر ہنستا ہی رہے گا

دیکھ لو! زمانہ ہنس رہا ہے، خدا کے لیے یہ پرواہ دل سے نکال دو کہ دنیا کیا کہے گی؟ بلکہ یہ دیکھو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کیا ہے؟ اس پر عمل کر کے دیکھو۔ ان شاء اللہ، دنیا سے عزت کراؤ گے، بالآخر مآلِ کار عزت تمہاری ہوگی، کیونکہ عزت سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کی اتباع میں ہے، کسی اور کی اتباع میں نہیں۔

اتباعِ سنّت پر عظیم بشارت

اتباعِ سنّت پر اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں اتنی عظیم بشارت دی ہے کہ اس کے برابر کوئی بشارت ہو ہی نہیں سکتی، چنانچہ فرمایا کہ

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (۱)

یعنی اے نبی! آپ لوگوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تمہیں اللہ سے محبت ہے، تو میری اتباع کرو، میرے پیچھے چلو اور جب میرے پیچھے چلو گے اور میری اتباع کروگے تو اللہ تعالیٰ تمہیں محبوب بنالے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ارے تم کیا اللہ تبارک تعالیٰ سے محبت کروگے، تمہاری کیا حقیقت، تمہاری کیا مجال کہ تم اللہ تبارک وتعالیٰ سے محبت کرسکو۔ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے، بشرطیکہ تم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی اتباع کرنے لگو۔ ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ یہ اس بات کی بشارت ہے کہ جس عمل کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی غرض سے اختیار کیا جائے، تو پھر جس وقت انسان وہ عمل کر رہا ہے، اس وقت وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب ہے، دیکھو یہ سنّت ہے کہ جب آدمی بیت الخلاء جائے تو جانے سے پہلے یہ دعا پڑھے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ (۲)

اور داخل ہوتے وقت بایاں پاؤں داخل کرے، تو جس وقت تم نے اس نیت سے بایاں پاؤں داخل کرتے ہو کہ یہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت ہے، اس وقت تم اللہ تبارک وتعالیٰ کے محبوب ہو۔ اس لیے کہ اس وقت تم اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کی اتباع کر رہے ہو۔

---

(۱) سورۃ آل عمران آیت (۳۱)۔
(۲) صحیح البخاری ۱/۴۰ (۱۴۲) وصحیح مسلم ۱/۲۸۳ (۳۷۵)۔

اللہ تعالیٰ اپنا محبوب بنالیں گے

اسی طرح جس وقت تم اس نیت سے یہ انگلی چاٹ رہے ہو کہ یہ حضور اقدس سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت ہے، اس وقت تم اللہ تعالیٰ کے محبوب ہو، اللہ تعالیٰ تم سے محبت کررہے ہیں۔ ارے تم مخلوق کی طرف کیوں دیکھتے ہو کہ وہ محبت کررہے ہیں یا نہیں؟ وہ اچھا سمجھ رہے ہیں یا نہیں؟ اس مخلوق کا خالق اور مالک جب تم سے محبت کر رہا ہے اور وہ کہہ رہا ہے کہ یہ کام بڑا اچھا ہے، پھر تمہیں کیا پرواہ کہ دوسرے پسند کریں یا نہ کریں۔ اس لیے سنتوں کے ان طریقوں کو اپنی زندگی میں داخل کریں۔ ان کو اپنائیں اور ان طعنوں کی پرواہ نہ کریں۔ اگر سنّت پر پہلے سے عمل نہیں ہے تو اب عمل شروع کردیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ آج کل ایسا زمانہ آگیا ہے کہ اس میں دین پر عمل کرنا بڑا مشکل ہے۔ ارے بھائی! ہم نے اپنے ذہن سے مشکل بنا رکھا ہے، ورنہ بتایئے کہ اس انگلیاں چاٹنے کی سنّت پر عمل کرنے میں کیا دشواری ہے؟ کون تمہارا ہاتھ روک رہا ہے؟ تمہارے مال و دولت میں یا راحت و آرام میں اس سنّت پر عمل کرنے سے کون سا خلل آرہا ہے؟ جب ایک سنّت کو اختیار کرلیا تو اللہ کی محبوبیت تمہیں حاصل ہوگئی اور اس سنّت کی برکات حاصل ہوگئیں۔ کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ ایک سنّت کے صلے میں تمہیں نواز دیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں تمام سنتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

انگلیاں دوسرے کو بھی چٹوانا جائز ہے

اس حدیث میں ایک اختیار اور دے دیا، فرمایا کہ ’’أو یلعقھا‘‘ یعنی اگر

انگلیاں خود نہیں چاٹے تو کسی اور کو چٹادے۔ علماء کرام نے لکھا ہے کہ اس کا منشا یہ ہے کہ بعض اوقات ایسی صورت ہوجاتی ہے کہ آدمی انگلیاں چاٹنے پر قادر نہیں ہوتا، ایسی صورت میں کسی اور کو چٹادے۔ مثلاً بچے کو چٹادے یا بلی کو چٹادے، کسی پرندے کو چٹادے، مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا رزق ضائع نہ ہو۔ اب اگر اس کو جاکر دھوڈالو گے تو وہ رزق ضائع ہوجائے گا اور مخلوق کو چٹادو تاکہ اس کو بھی برکت حاصل ہوجائے۔

کھانے کے بعد برتن چاٹنا

"عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما: أن رسول اللہ ﷺ أمر بلعق الاصابع والصحفة وقال: إنكم لا تدرون في أيِ طعامكم البَرَكة"(1)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انگلیاں چاٹنے اور پیالہ چاٹنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ تم نہیں جانتے کہ تمہارے کھانے کے کس حصے میں برکت ہے؟

اس حدیث میں ایک ادب اور بیان فرمایا ہے۔ وہ یہ کہ کھانے کے بعد انگلیاں بھی چاٹے اور جس برتن میں کھارہا ہے۔ اس برتن کو بھی چاٹ کر صاف کرلے، تاکہ اللہ تعالیٰ کے رزق کی ناقدری نہ ہو، ویسے برتن میں اتنا ہی سالن نکالنا چاہیے، جتنا کھاسکنے کی توقع ہو، زیادہ نہ نکالے، تاکہ بعد میں بچے نہیں، لیکن

(1) صحیح مسلم ۱۶۰۶/۳ (۲۰۳۳) ومسند الحمیدی ۳۲۵/۲ (۱۲۷۰) ومسند احمد ۳۸۹/۲۳ (۱۵۲۲٤)۔

اگر بالفرض کھانا پلیٹ میں زیادہ نکل آیا اور کھانا بچ گیا اور اب کھانے کی گنجائش باقی نہ رہی، ایسے موقع پر بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پلیٹ میں جتنا سالن نکال لیا ہے، اس سب کو کھا کر ختم کرنا ضروری ہے، حتیٰ کہ بعض لوگ اسے فرض واجب سمجھنے لگے ہیں چاہے بعد میں ہیضہ ہی کیوں نہ ہوجائے۔ یاد رکھیے! شریعت میں یہ حکم نہیں کہ ضرور پورا کھانا کھاؤ، بلکہ شریعت کا اصل طریقہ یہ ہے کہ اول تو زیادہ کھانا نکالو ہی نہیں، لیکن اگر زیادہ کھانا نکل آئے تو اس کو چھوڑ دینے کی گنجائش ہے، لیکن اس کو اس طرح چھوڑو کہ وہ چھوڑا ہوا کھانا پیالے کے ایک طرف ہو، پورے پیالے میں پھیلا ہوا نہ ہو، پورا پیالہ گندا اور سنا ہوا نہ ہو، لہٰذا اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے سامنے سے کھا کر اس حصے کو صاف کرلو، تاکہ آپ کا بچا ہوا کھانا کسی اور کو دیا جائے تو اس کو گھن نہ آئے، اس کو پریشانی نہ ہو۔ اسلام کی صحیح تعلیم یہ ہے۔

ورنہ چمچے کو چاٹ لے

بعض اوقات آدمی ہاتھ سے کھانا نہیں کھاتا، بلکہ چمچوں سے کھانا کھاتا ہے، اس وقت انگلیوں کے چاٹنے کی سنت پر کس طرح عمل کرے؟ اس لیے کہ انگلیوں پر کھانا لگا ہی نہیں۔ تو بعض علماء نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص چمچے سے کھا رہا ہے تو چمچے پر جو کھانا لگا ہوا ہے، اس کو اس نیت سے چاٹ لے کر نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ معلوم نہیں کہ کھانے کے کس حصے میں برکت ہے؟ اب کھانا میری انگلیوں پر لگا نہیں ہے۔ مگر چمچوں پر لگا ہوا ہے۔ اس کو صاف کرلے، تو امید ہے کہ ان شاء اللہ، اس سنت کی فضیلت اس میں بھی حاصل ہوجائے گی۔

گرا ہوا لقمہ اٹھا کر کھا لینا چاہیے

"عن جابر بن عبد الله رضی اللہ عنہما أن رسول الله ﷺ قال:
«اِذا وقعت لقمة احدكم فليأخذها فليمط ما كان بها من اذى وليأكلها، ولا يدعها للشيطان، ولا يمسح يده بالمنديل بل حتى يلعق اصابعه، فاِنّه لا يدرى فى ايّ طعامه البركة»(۱)

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر کھانے کے دوران کسی شخص کا لقمہ گر جائے، تو اس کو چاہیے کہ وہ اس لقمے کو اٹھالے۔ اگر اس لقمہ پر کوئی مٹی وغیرہ لگ گئی ہے تو اس کو صاف کرلے اور پھر اس کو کھالے اور شیطان کے لیے اس کو نہ چھوڑے اور اپنا ہاتھ رومال سے صاف نہ کرے، جب تک کہ اپنی انگلیاں نہ چاٹ لے، کیونکہ وہ نہیں جانتا کہ برکت کھانے کے کس حصے میں ہے۔

اس حدیث میں یہ ادب بتادیا کہ بعض اوقات کھانا کھاتے وقت کوئی لقمہ یا کوئی چیز گر جائے تو اس کو اٹھا کر صاف کر کے کھالینی چاہیے، بعض اوقات انسان اس کو اٹھا کر کھاتے ہوئے شرماتا ہے اور جھجکتا ہے، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

(۱) صحیح مسلم ۱۶۰۶/۳ (۲۰۳۳) ومسند الحمیدی ۳۲۵/۲ (۱۲۷۰) ومسند احمد ۳۸۹/۲۳ (۱۵۲۲٤)۔

نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو، اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا رزق ہے، اس کی عطا ہے، اس کی ناقدری نہ کرو، اس کو اٹھا کر صاف کر کے کھالو۔ البتہ اگر وہ لقمہ اس طرح گر گیا کہ بالکل ملوث یا ناپاک ہوگیا اور گندہ ہوگیا اور اب اس کو صاف کر کے کھانا ممکن نہیں ہے تو دوسری بات ہے، مجبوری ہے، لیکن اس کو اٹھا کر صاف کر کے کھایا جاسکتا ہو، اس وقت تک نہ چھوڑو۔ اس لیے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا رزق ہے، اس کی قدر اور تعظیم واجب ہے۔ جب تک اللہ تعالیٰ کے رزق کے چھوٹے حصوں کی قدر اور تعظیم نہیں کروگے اس وقت تک تمہیں رزق کی برکت حاصل نہیں ہوگی۔

اس میں بھی وہی بات ہے کہ گرے ہوئے لقمے کو اٹھا کر کھانا آج کل کی تہذیب اور ایٹیکیٹ کے خلاف ہے، اس لیے آدمی اس سے شرماتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ اگر میں اس کو اٹھاؤں گا تو لوگ کہیں گے کہ یہ بڑا ندیدہ ہے، لیکن اس پر ایک واقعہ سن لیجیے۔

ان عجمیوں کی وجہ سے سنّت چھوڑ دوں؟

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے کہ اتنے میں ان کے ہاتھ سے لقمہ گر گیا، انہوں نے وہ لقمہ زمین سے اٹھا کر اسے صاف کیا پھر کھا لیا، اس مجلس میں کچھ عجمی دہقان بھی موجود تھے، تو کسی نے حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے کہا کہ یہ دہقان لوگ آپ کے زمین سے لقمہ اٹھانے پر ایک دوسرے کو اشارے کر رہے ہیں جبکہ دوسرا کھانا آپ کے سامنے موجود ہے، اس پر حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"إني لم أكن لأدع ما سمعت من رسول الله ﷺ لهذه الأعاجم"(۱)

میں نے جو بات رسول اللہ ﷺ سے سنی ہے اسے میں ان عجمیوں کی وجہ سے چھوڑنے والا نہیں ہوں۔

ان کا اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ رسول کریم ﷺ نے یہ تعلیم دی ہے کہ کھانا کھاتے ہوئے اگر کسی کا لقمہ گر جائے تو وہ اٹھا کر اسے صاف کر لے اور کھالے، حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا حاصل یہ تھا کہ دیکھنے والے اچھا سمجھیں یا برا سمجھیں، عزت کریں یا مذاق اڑائیں، میں رسول کریم ﷺ کی سنت نہیں چھوڑ سکتا۔ اب بتایئے کہ عزت ان حضرات نے کرائی یا آج ہم غیروں کی خاطر سنتیں چھوڑ کر عزت کروا رہے ہیں؟ درحقیقت ان حضرات نے نبی کریم ﷺ کی سنتوں پر عمل کر کے قیصر و کسریٰ کا غرور خاک میں ملایا۔

حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ کا واقعہ

اسی طرح جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جہاد کے لیے ایران پہنچے تو کسریٰ کے سپہ سالار رستم سے مذاکرات کی بات طے ہوئی، رستم نے اپنے سرداروں سے مشورے کے بعد یہ طے کیا کہ جب ان کا کوئی ایلچی آئے تو اپنے لباس،

(۱) سنن ابن ماجه ۲۱/۵ (۳۲۷۸) وقال البوصيري في "مصباح الزجاجة" (۱۲/٤): هذا إسناد رجاله ثقات، غير أنه منقطع، قال أبو حاتم: الحسن لم يسمع من معقل بن يسار، انتهى، رواه مسدد في مسنده عن يزيد بن زريع بإسناده ومتنه، وله شاهد في صحيح مسلم وغيره من حديث جابر بن عبد الله، وأنس بن مالك.

ہتھیاروں اور ماحول کی شان وشوکت سے ان کو مرعوب کرنے کی کوشش کریں، چنانچہ رستم کے لیے سونے کا تخت بچھایا گیا اور ایسے لباس پہنائے گئے اور ایسے قالین بچھائے گئے اور ایسے تکیے رکھے گئے جو سونے سے بُنے ہوئے تھے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ ایک چھوٹے سے گھوڑے پر سوار معمولی لباس میں تشریف لائے، جبکہ ان کی تلوار ایک بوسیدہ کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی، نیزے پر اونٹ کی گردن کا غلاف چڑھا ہوا تھا اور گائے کی کھال کی ڈھال ان کے ہاتھ میں تھی جس پر سرخ رنگ کا چمڑا چڑھا ہوا تھا، اس کے علاوہ تیر کمان بھی ان کے ساتھ تھا۔ حضرت ربعی رضی اللہ عنہ سمجھ گئے تھے کہ یہ ہمیں اپنی شان وشوکت سے مرعوب کرنا چاہتے ہیں اور ہمارے لباسوں اور ہتھیاروں کی توہین مقصود ہے، تو جب وہ ان کے بچھائے ہوئے فرش کے قریب پہنچے تو اپنے گھوڑے سمیت اس طرح داخل ہوئے کہ اپنے نیزے پر سہارا لیے ہوئے تھے اور نیزے کی انّی قالینوں کو چھورہی تھی۔ رستم کے پاس پہنچ کر حضرت ربعی رضی اللہ عنہ زمین پر بیٹھ گئے اور نیزہ قالین پر گاڑ دیا اور فرمایا کہ ہم تمہاری اس زیب وزینت پر بیٹھنا پسند نہیں کرتے۔

جب مذاکرات کے بعد باہر نکلے تو لوگ ان کے ہتھیاروں کو معمولی سمجھتے ہوئے گویا زبان حال سے یہ کہہ رہے تھے کہ یہ ہیں وہ ہتھیار جن سے تم ایران فتح کرنے نکلے ہو؟ حضرت ربعی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کیا تم ان ہتھیاروں کو واقعی دیکھنا چاہتے ہو؟ اور یہ کہہ کر اپنی تلوار بوسیدہ کپڑے سے نکالی، وہ ایک شعلہ کی طرح چمک رہی تھی، پھر فرمایا کہ تم بھی اپنی ڈھال سامنے رکھو اور میں اپنی ڈھال سامنے رکھتا ہوں اور دونوں پر تیر مار کر دیکھتے ہیں، انہوں

نے حضرت ربعی رضی اللہ عنہ کی ڈھال پر تیر چلایا تو اس کا کچھ نہ بگڑا اور حضرت ربعی رضی اللہ عنہ نے ان کی شاندار ڈھال پر تیر چلایا تو اسے پھاڑ کر رکھ دیا، پھر فرمایا:

اے اہل فارس! تم نے کھانے پینے اور لباس میں عزت سمجھی ہے، لہٰذا اس کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے اور ہماری نظر میں اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

حضرت ربعی رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت حذیفہ بن محصن اور حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم بھی اسی شان سے دربار میں تشریف لے گئے۔(۱)

خلاصہ یہ کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دلوں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی عظمت تھی اس کے مقابلے میں وہ کسی بھی طور طریقے کو خاطر میں نہیں لاتے تھے، چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی اتباع میں، آپ کی سنتوں کی تعمیل میں، ان حضرات صحابہ نے دنیا بھر میں اپنا لوہا منوایا۔

مذاق اڑانے کے ڈر سے سنّت چھوڑنا کب جائز ہے؟

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ اگر کوئی سنّت ایسی ہے جس کا ترک بھی جائز ہے اور اس بات کا اندیشہ ہے کہ اگر اس سنّت پر عمل کیا گیا تو کچھ مسلمان جو بے فکر اور آزاد خیال ہیں وہ اس سنّت کا مذاق اڑا کر کفر وارتداد میں مبتلا ہوں گے، تو ایسے موقع پر اس سنّت پر عمل چھوڑ دے تو یہ جائز ہے۔ مثلاً زمین پر بیٹھ کر کھانا سنّت سے قریب تر ہے، لیکن اگر آپ کسی وقت ہوٹل یا

(۱) تاریخ طبری ۳/۵۱۸ تا ۵۲۱ طبع دار التراث۔ بیروت۔ والمنتظم فی تاریخ الملوک والامم لابن الجوزی ۴/۱۶۳ تا ۱۶۸۔

ریسٹورنٹ میں کھانے کے لیے چلے گئے، وہاں کرسیاں بچھی ہوئی ہیں۔ اب آپ نے وہاں جا کر یہ سوچا کہ زمین پر بیٹھ کر کھانا سنّت سے زیادہ قریب ہے، چنانچہ وہیں پر آپ زمین پر رومال بچھا کر بیٹھ گئے، تو اس صورت میں اگر سنّت کی توہین اور تضحیک کا اندیشہ ہو اور اس سے لوگوں کے کفر اور ارتداد میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں بہتر یہ ہے کہ اس وقت آدمی اس سنّت کو چھوڑ دے اور کرسی پر بیٹھ کر کھالے۔

لیکن یہ اس وقت ہے جب اس سنّت کو چھوڑنا جائز ہو، لیکن جہاں اس سنّت کو چھوڑنا جائز اور مباح نہ ہو، وہاں کسی کے مذاق اڑانے کی وجہ سے اس سنّت کو چھوڑنا جائز نہیں۔ دوسرا یہ کہ مسلمان کی بات اور ہے، کافر کی بات اور ہے، اس لیے کہ مسلمان کے اندر تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ سنّت کا مذاق اڑانے کے نتیجے میں کافر ہوجائے گا، لیکن اگر کافروں کا مجمع ہے تو وہ پہلے ہی سے کافر ہیں، ان کا مذاق اڑانے سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ لہٰذا وہاں سنّت پر عمل کو چھوڑنا درست نہیں ہوگا۔

کھانے کے وقت اگر کوئی مہمان آجائے تو

وعن جابر بن عبد الله رضي الله عنهما قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: «طعام الواحد يكفي الاثنين، وطعام الاثنين يكفي الاربعة، وطعام الاربعة يكفي الثمانية»(۱)

(۱) صحیح مسلم ۱۶۳۰/۳ (۲۰۵۹) ومسند احمد ۱۳۰/۲ (۱۴۲۲)۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ایک آدمی کا کھانا دو آدمیوں کے لیے کافی ہوجاتا ہے اور دو آدمیوں کا کھانا چار کے لیے کافی ہوجاتا ہے اور چار کا کھانا آٹھ کے لیے کافی ہوجاتا ہے۔

اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اصول بیان فرمایا کہ اگر تم کھانے بیٹھے اور اس وقت کوئی مہمان یا ضرورت مند آگیا تو اس مہمان کو یا اس ضرورت مند کو صرف اس وجہ سے واپس مت لوٹاؤ کہ کھانا تو ہم نے ایک ہی آدمی کا بنایا تھا، اگر اس مہمان کو یا ضرورت مند کو کھانے میں شریک کرلیا تو کھانے میں کمی واقع ہوجائے گی، بلکہ ایک آدمی کا کھانا دو آدمی کے لیے بھی کافی ہوجاتا ہے۔ اس لیے ضرورت مند کو واپس مت لوٹاؤ، بلکہ اس کو بھی کھانے میں شریک کرلو، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کھانے میں برکت عطا فرمائیں گے اور جب ایک کا کھانا دو کے لیے کافی ہوجاتا ہے تو دو کا کھانا چار کے لیے، اور چار کا کھانا آٹھ کے لیے کافی ہوجاتا ہے۔

سائل کو ڈانٹ کر مت بھگاؤ

ہمارے یہاں یہ عجیب رواج پڑگیا ہے کہ مہمان اسی کو سمجھا جاتا ہے جو ہمارے ہم پلہ ہو یا جس سے شناسائی ہو، دوستی ہو یا عزیز قریبی رشتہ دار ہو اور وہ اپنے ہم پلہ اور اپنے اسٹیٹس کا ہو، وہ تو حقیقت میں مہمان ہے اور جو بے چارہ غریب اور مسکین آجائے تو کوئی شخص اس کو مہمان نہیں مانتا، بلکہ اس کو بھکاری

سمجھا جاتا ہے، کہتے ہیں کہ یہ مانگنے والا آ گیا، حالانکہ حقیقت میں وہ بھی اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا مہمان ہے۔ اس کا اکرام کرنا بھی ہر مسلمان پر لازم ہے، لہٰذا اگر کھانے کے وقت ایسا مہمان آجائے تو اس کو بھی کھانے میں شریک کرلو، اس کو واپس مت کرو۔ اس میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے کہ اگر کھانے کے وقت سائل آجائے تو اس کو واپس لوٹانا اچھی بات نہیں، اس کو کچھ دے کر رخصت کرنا چاہیے اور اس سے تو ہر حال میں پرہیز کرنا چاہیے کہ اس کو ڈانٹ کر بھگا دیا جائے۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

وَاَمَّا السَّآىِٕلَ فَلَا تَنْهَرْ (۱)

سائل کو جھڑکو نہیں۔

اس لیے کہ حتی الامکان اس بات کی کوشش کرو کہ جھڑکنے کی نوبت نہ آئے، اس لیے بعض اوقات آدمی اس کے اندر حدود سے تجاوز کر جاتا ہے، جس کے نتیجے میں بڑے خراب حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔

ایک عبرت آموز واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مواعظ میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک صاحب بڑے دولت مند تھے، ایک مرتبہ وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے، کھانا بھی اچھا بنا ہوا تھا۔ اس لیے بہت شوق و ذوق سے کھانا کھانے کے لیے بیٹھے، اتنے میں ایک سائل دروازے پر آ گیا، اب کھانے کے دوران سائل کا آنا ان کو ناگوار ہوا، چنانچہ انہوں نے اس سائل کو ڈانٹ ڈپٹ کر ذلیل کر کے

(۱) سورۃ الضحیٰ آیت (۱۰)۔

باہر نکال دیا۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ بعض اوقات انسان کا ایک عمل اللہ کے غضب کو دعوت دیتا ہے۔ چنانچہ کچھ عرصے بعد میاں بیوی میں ان بن شروع ہوگئی، لڑائی جھگڑے رہنے لگے، یہاں تک کہ طلاق کی نوبت آگئی اور اس نے طلاق دے دی۔ بیوی نے اپنے میکے میں آکر عدت گزاری اور عدت کے بعد کسی اور شخص سے اس کا نکاح ہوگیا، وہ بھی ایک دولت مند آدمی تھا، پھر وہ ایک دن اپنے اس دوسرے شوہر کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھارہی تھی کہ اتنے میں دروازے پر ایک سائل آگیا، چنانچہ بیوی نے اپنے شوہر سے کہا کہ میرے ساتھ ایک واقعہ پیش آچکا ہے۔ مجھے اس بات کا خطرہ ہے کہ کہیں اللہ کا غضب نازل نہ ہوجائے۔ اس لیے میں پہلے اس سائل کو کچھ دے دوں۔ شوہر نے کہا دے آؤ، جب وہ دینے گئی تو اس نے دیکھا کہ وہ سائل جو دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ اس کا پہلا شوہر تھا۔

چنانچہ وہ حیران رہ گئی اور واپس آکر اپنے شوہر کو بتایا کہ آج میں نے عجیب منظر دیکھا کہ یہ سائل وہ میرا پہلا شوہر ہے جو بہت دولت مند تھا۔ میں ایک دن اس کے ساتھ اسی طرح بیٹھی کھانا کھارہی تھی کہ اتنے میں دروازے پر ایک سائل آگیا اور اس نے اس کو جھڑک کر بھگادیا تھا۔ جس کے نتیجے میں اب اس کا یہ حال ہوگیا، اس شوہر نے کہا کہ میں تمہیں اس سے زیادہ عجیب بات بتاؤں کہ وہ سائل جو تمہارے شوہر کے پاس آیا تھا وہ درحقیقت میں ہی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی دولت دوسرے شوہر کو عطا فرمادی اور اس کا فقر اس کو دے دیا۔ اللہ تعالیٰ بُرے وقت سے محفوظ رکھے۔ آمین۔ نبی کریم ﷺ نے اس بات سے پناہ مانگی ہے۔ فرمایا:

اللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْحَوْرِ بَعْدَ الْکَوْرِ [1]
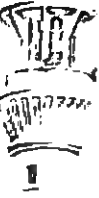
اے اللہ! اچھی حالت کے بعد بری حالت سے محفوظ فرما۔

بہرحال! کسی بھی سائل کو ڈانٹنے ڈپٹنے سے حتی الامکان پرہیز کرو، البتہ بعض اوقات ایسا موقع آجاتا ہے کہ ڈانٹنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ تو فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے، لیکن حتی الامکان اس بات کی کوشش کرو کہ ڈانٹنے کی ضرورت پیش نہ آئے، بلکہ کچھ دے کر رخصت کردو۔

اس حدیث کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اپنے کھانے کی مقدار کو پتھر کی لکیر مت بناؤ کہ جتنا کھانے کا معمول ہے روزانہ اتنا ہی کھانا ضروری ہے، بلکہ اگر کبھی کسی وقت کچھ کمی کا موقع آجائے تو اس کی بھی گنجائش رکھو، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک آدمی کا کھانا دو کے لیے اور دو کا کھانا چار کے لیے اور چار کا کھانا آٹھ کے لیے کافی ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس کی حقیقت سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد

بہرحال! کھانے کی تقریباً اکثر سنتوں کا بیان ہوچکا، اگر ان سنتوں پر عمل نہیں ہے، تو آج ہی سے اللہ کے نام سے ان پر عمل کرنے کا ارادہ کرلیں۔ یقین رکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نورانیت، روحانیت اور دوسرے عجیب وغریب فوائد اتباعِ سنّت میں رکھے ہیں، وہ ان شاء اللہ ان چھوٹی چھوٹی سنتوں پر عمل کرنے

(۱) صحیح مسلم ۲/۲۷۹ (۱۳۴۳) وسنن الترمذی ۵/۴۳۸ (۳۴۳۹) وسنن النسائی ۸/۲۷۲ (۵۴۹۸)۔

سے بھی حاصل ہوجائیں گے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ کا ارشاد بار بار سننے کا ہے، فرماتے ہیں کہ

''اللہ تعالیٰ نے مجھے علومِ ظاہرہ سے سرفراز فرمایا، حدیث پڑھی، تفسیر پڑھی، فقہ پڑھی، گویا تمام علومِ ظاہرہ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائے، اس میں اللہ تعالیٰ نے مجھے کمال بخشا، اس کے بعد مجھے خیال ہوا کہ یہ دیکھنا چاہیے کہ صوفیاءِ کرام کیا کہتے ہیں؟ ان کے پاس کیا علوم ہیں؟ چنانچہ ان کی طرف متوجہ ہوکر ان کے علوم حاصل کیے، صوفیاء کرام کے جو چار سلسلے ہیں۔ سہروردیہ، قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ، ان سب کے بارے میں دل میں یہ جستجو پیدا ہوئی کہ کون سا سلسلہ کیا طریقہ تعلیم کرتا ہے؟ سب کی سیر کی اور چاروں سلسلوں میں جتنے اعمال، جتنے اشغال، جتنے اذکار، جتنے مراقبات، جتنے چلّے ہیں۔ وہ سب انجام دیے، سب کچھ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسا مقام بخشا کہ خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے مجھے خلعت پہنایا، پھر اللہ تعالیٰ نے اتنا اونچا مقام بخشا کہ اصل کو پہنچا، پھر اصل سے ظل کو پہنچا، حتیٰ کہ میں ایسے مقام پر پہنچا کہ اگر اس کو زبان سے ظاہر کروں تو علماءِ ظاہر مجھ پر کفر کا فتویٰ لگادیں، علماءِ باطن مجھ پر زندیق ہونے کا فتویٰ لگادیں، لیکن میں کیا کروں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے واقعتاً اپنے فضل سے یہ سب مقامات عطا

فرمائے۔ اب یہ سارے مقامات حاصل کرنے کے بعد ایک دعا کرتا ہوں، اور جو شخص اس دعا پر آمین کہہ دے گا ان شاء اللہ اس کی بھی مغفرت ہوجائے گی: وہ دعا یہ ہے کہ اے اللہ! مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنّت کی اتباع کی توفیق عطا فرما، آمین۔ اے اللہ! مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنّت پر زندہ رکھ۔ آمین۔ اے اللہ! مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنّت پر ہی موت عطا فرما۔ آمین۔

سنتوں پر عمل کریں

بہرحال! تمام مقامات کی سیر کرنے کے بعد آخر میں نتیجہ یہی ہے کہ جو کچھ ملے گا وہ نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنّت کی اتباع میں ملے گا۔ تو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں تو سارے مقامات کی سیر کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا، تم پہلے دن پہنچ جاؤ، پہلے ہی دن اس بات کا ارادہ کرلو کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جتنی سنتیں ہیں۔ ان پر عمل کروں گا، پھر اس کی برکت اور نورانیت کو دیکھو گے، پھر زندگی کا لطف دیکھو۔ یاد رکھو! زندگی کا لطف فسق و فجور میں نہیں ہے، گناہوں میں نہیں ہے، اس زندگی کا لطف ان لوگوں سے پوچھو جنہوں نے اپنی زندگی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتوں میں ڈھال لیا ہے۔ حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زندگی کا جو لطف اور اس کا جو کیف اور لذت ہمیں عطا فرمائی ہے۔ اگر ان دنیا کے بادشاہوں کو پتہ لگ جائے تو تلواریں سونت کر ہمارے مقابلے کے لیے آجائیں۔ تاکہ ان کو یہ لذت حاصل

ہوجائے۔ ایسی لذت اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی ہے، لیکن کوئی اس پر عمل کر کے دیکھے، اس راہ پر چل کر دیکھے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم اور اپنی رحمت سے ہم سب کو اتباعِ سنّت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

رزق کا صحیح استعمال

(ذکر و فکر ص ۱۷)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رزق کا صحیح استعمال

حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جو اپنے ملنے والوں میں حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے معروف تھے) دارالعلوم دیوبند کے ان اساتذہ میں سے تھے جو شہرت اور نام و نمود سے ہمیشہ کوسوں دور رہے، عمر بھر اسلامی علوم کی تدریس کی خدمات انجام دی اور ہزارہا طلبہ کو اپنے علم و فضل سے سیراب کیا، آج برصغیر ہند و پاک کے نامور علماءِ دیوبند میں شاید کوئی نہ ہو جو ان کا بالواسطہ شاگرد نہ ہو، انہوں نے متعدد چھوٹی بڑی تصانیف بھی چھوڑی ہیں، موضوعات بھی اچھوتے اور زبان بھی اتنی شگفتہ کہ آج سے سو سال پہلے کی تحریروں میں ایسی شگفتگی کم ملتی ہے۔

علم و فضل کے مقامِ بلند کے باوجود سادگی، تواضع اور مسکنت کا عالم یہ تھا کہ دیکھنے والا ان کے سراپا میں اس مقام بلند کا اندازہ کر ہی نہیں سکتا تھا، وہ دیوبند (ضلع سہارنپور) کے ایک چھوٹے سے محلے میں مقیم تھے اور کچے مکان میں رہتے تھے۔ ہر سال جب برسات کا موسم آتا تو یہ کچا مکان جگہ جگہ سے

گر جاتا اور برسات گزرنے کے بعد کافی وقت اور پیسہ اس کی مرمت پر خرچ کرنا پڑتا تھا۔

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شاگرد تھے، لیکن خصوصی تعلق کی بنا پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں اپنے آپ سے بہت بے تکلف بھی بنایا ہوا تھا، ایک دن انہوں نے حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ آپ کو ہر سال اپنے مکان کی مرمت کرانی پڑتی ہے، جس میں پریشانی بھی ہوتی ہے، وقت بھی لگتا ہے اور خرچ بھی خاصا ہوتا ہے، اگر آپ ایک مرتبہ مکان کو پکا بنوالیں تو اس روز روز کی پریشانی سے نجات مل جائے۔

حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت میں ظرافت بھی بہت تھی، انہوں نے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ تجویز سن کر شروع میں بڑی تعریف وتوصیف اور مسرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: ''واہ مفتی صاحب واہ! آپ نے کیسی عقل کی بات کہی، ہم نے ساری عمر گزار دی، بوڑھے ہوگئے اور اب تک ہماری عقل میں یہ بات نہیں آئی''۔

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بات اتنی مرتبہ فرمائی کہ میں شرم سے پانی پانی ہوگیا، لیکن بالآخر میں نے عرض کیا کہ ''حضرت! میرا مقصد تو وہ حکمت معلوم کرنا تھا جس کی وجہ سے آپ نے مالی استطاعت کے باوجود اب تک مکان کو پکا نہیں بنوایا، اب مجھے مزید شرمندہ کرنے کے بجائے حقیقی وجہ بیان فرمادیجیے''۔

حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ شروع میں طرح دیتے رہے، لیکن جب والد

صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے زیادہ اصرار کیا تو والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہاتھ پکڑ کر مکان کے دروازے تک لے آئے اور فرمایا: ''دیکھو! اس گلی کے دائیں بائیں دونوں طرف دیکھو، گلی کے اِس سرے سے اُس سرے تک کیا کوئی مکان تمہیں پکّا نظر آتا ہے؟'' والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا نہیں، اس پر میاں صاحب نے فرمایا کہ بتاؤ، جب میرے سارے پڑوسیوں کے مکان کچے ہیں، تو پوری گلی میں تنہا میں اپنا مکان پکّا بنا کر کیا اچھا لگوں گا؟ اور اتنی استطاعت مجھ میں نہیں ہے کہ میں اپنے سارے پڑوسیوں کے مکانات پکے بنوا سکوں، اس لیے میں اپنا مکان بھی پکّا نہیں بنواتا کہ اپنے پڑوسیوں کے مقابلے میں اپنی کوئی امتیازی شان بنانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔

یہ تھے حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ، ان کا یہ واقعہ تو میں نے ان کے مزاج ومذاق کا تھوڑا سا تعارف کرانے کے لیے بیان کردیا جس سے ان کی اس عظمتِ کردار کا تھوڑا سا اندازہ لگایا جاسکتا ہے جو مادہ پرستی کے اس دور میں انسانی تصور سے بھی ماوراء معلوم ہوتا ہے، لیکن دراصل میں ان کا ایک اور واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔

ایک مرتبہ میرے والدِ ماجد رحمۃ اللہ علیہ ان کے گھر ملاقات کے لیے گئے ہوئے تھے، کھانے کا وقت آگیا تو بیٹھک میں دسترخوان بچھا کر کھانا کھایا گیا، کھانے سے فارغ ہونے پر والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ دسترخوان سمیٹنے لگے، تاکہ اسے کہیں جھٹک آئیں، حضرت میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا: ''یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟'' والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کیا کہ ''حضرت دسترخوان سمیٹ رہا ہوں تاکہ اسے کسی مناسب جگہ پر جھٹک دوں'' میاں صاحبؒ بولے ''کیا آپ کو دسترخوان

سمیٹنا آتا ہے؟'' والد صاحبؒ نے کہا کہ ''کیا دسترخوان سمیٹنا بھی کوئی فن ہے جسے سیکھنے کی ضرورت ہو؟'' میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا: ''جی ہاں، یہ بھی ایک فن ہے اور اسی لیے میں نے آپ سے پوچھا کہ آپ کو یہ کام آتا ہے یا نہیں؟''۔ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے درخواست کی کہ ''حضرت! پھر تو یہ فن ہمیں بھی سکھا دیجیے'' میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آیئے! میں آپ کو یہ فن سکھاؤں۔ یہ کہہ کر انہوں نے دسترخوان پر بچی ہوئی بوٹیاں الگ کیں، ہڈیوں کو الگ جمع کیا، روٹی کے جو بڑے ٹکڑے بچ گئے تھے، انہیں الگ رکھا، پھر روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جو برادے کی سی شکل میں پڑے رہ گئے تھے، انہیں چُن چُن کر الگ اکٹھا کرلیا، پھر فرمایا کہ ''میں نے ان میں سے ہر چیز کی الگ جگہ مقرر کی ہوئی ہے، یہ بوٹیاں میں فلاں جگہ اٹھا کر رکھتا ہوں، وہاں روزانہ ایک بلی آتی ہے اور یہ بوٹیاں کھالیتی ہے، ان ہڈیوں کی الگ جگہ مقرر ہے، کتے کو وہ جگہ معلوم ہے اور وہاں سے آکر یہ ہڈیاں اٹھالیتا ہے اور روٹی کے یہ بڑے ٹکڑے میں فلاں جگہ رکھتا ہوں، وہاں پرندے آتے ہیں اور یہ ٹکڑے ان کے کام آجاتے ہیں اور یہ جو روٹی کے بہت چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں، یہ میں چیونٹیوں کے کسی بل کے پاس رکھ دیتا ہوں اور یہ ان کی غذا بن جاتی ہے۔'' پھر فرمایا کہ

> ''یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کا رزق ہیں، ان کا کوئی حصہ اپنے امکان کی حد تک ضائع نہیں ہونا چاہیے''

یہ تھا ایک حقیقی اسلامی معاشرے کا وہ مزاج جو قرآن وسنّت کے دلکش رنگ میں ڈھلا ہوا تھا، چونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بے حساب رزق عطا فرمایا ہوا ہے، اس لیے اس کے چھوٹے چھوٹے اور تھوڑے تھوڑے حصوں کی ہمیں نہ صرف یہ

کہ قدر نہیں ہوتی، بلکہ بسا اوقات ہم اس کی بے حرمتی تک پر آمادہ ہو جاتے ہیں، لیکن اگر کسی وقت خدانخواستہ اسی رزق کی قلت پیدا ہو جائے تو پتہ چلے کہ ایک ایک ذرّے کی کیا قدر و قیمت ہے؟

کہنے کو سبھی یہ کہتے ہیں کہ رزق کو ضائع نہیں کرنا چاہیے، اس کی قدر کرنی چاہیے، لیکن ہماری آج کی زندگی میں یہ بات محض ایک نظریہ ہو کر رہ گئی ہے، جس کا عمل کی دنیا میں کوئی نشان نظر نہیں آتا، ہمارے گھروں میں دعوتوں کے مواقع پر اور ہوٹلوں میں جتنا رزق روزانہ ضائع ہوتا ہے، اگر اس کا مجموعی اندازہ لگایا جائے تو یقیناً وہ سینکڑوں خاندانوں کا پیٹ بھرنے کے لیے کافی ہوسکتا ہے، لیکن حالت یہ ہے کہ جس ماحول میں نہ جانے کتنے گھرانے معمولی غذا کو ترس رہے ہوتے ہیں، وہاں منوں کے حساب سے اعلیٰ ترین غذائیں کوڑے کرکٹ پر نظر آتے ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں پہلی بار ایک سرکاری عشائیے میں شریک ہوا تو مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ڈرائیوروں کے لیے کھانے کا انتظام ہوگا یا نہیں؟ چنانچہ میں نے بر بنائے احتیاط اپنے ڈرائیور کو کھانے کے پیسے دے کر یہ کہہ دیا تھا کہ اگر یہاں کھانے کا انتظام نہ ہو تو وہ کسی ہوٹل میں کھانا کھالے۔ جب میں اندر پہنچا تو میری میز پر ایک اعلی سرکاری افسر میرے ہم نشین تھے اور وہ ملک کے غریبوں کی حالت زار پر بڑا پُر درد لیکچر دے رہے تھے، اس لیکچر میں عوام کی غربت و افلاس پر رنج وغم کا اظہار بھی تھا، اپنے معاشی نظام کی برائیاں بھی تھیں، سوشلسٹ ممالک کی تعریف بھی تھی اور اپنے ملک کے سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور سوشلزم کے مخالف عناصر پر تنقید بھی تھی، جب ان کی گفتگو کا یہ موضوع ختم ہوگیا اور کھانا شروع ہونے پر مختلف باتیں شروع ہوگئیں تو میں نے انہی صاحب

سے عرض کیا کہ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ڈرائیوروں کے لیے کھانے کا کوئی انتظام نہیں ہے'' کہنے لگے، جی ہاں! اس سطح کی دعوتوں میں عموماً یہ انتظام نہیں ہوتا، میں نے عرض کیا کہ، ''مجھے تو یہ بات بہت بری لگتی ہے کہ ہم یہاں کھانا کھا رہے ہوں اور ہمارے ڈرائیور باہر بھوکے کھڑے ہوں''، اس پر انہوں نے خاصی بے پروائی سے جواب دیا کہ ''جی ہاں! یہ بات ہے تو تکلیف دہ، مگر اتنے سارے ڈرائیوروں کا انتظام بھی تو مشکل ہے اور یہ لوگ اس بات کے عادی ہیں، وہ بعد میں گھر جا کر کھانا کھالیتے ہیں''۔

اسی دعوت کے اختتام پر میں نے پلیٹوں اور ڈونگوں میں بچے ہوئے کھانے کا اندازہ لگایا تو میرا غالب گمان یہ تھا کہ اس میں تھوڑا سا اضافہ کر کے وہ کھانا تمام ڈرائیوروں کے لیے کافی ہوسکتا تھا، کھانے کے بعد عشائیہ میں تقریروں کا بھی سلسلہ تھا اور وہ اتنا دراز ہوا کہ ہم گیارہ بجے کے بعد وہاں سے روانہ ہوسکے، راستے میں میں نے اپنے ڈرائیور سے پوچھا کہ تمہارے کھانے کا کیا ہوا؟ اس نے بتایا کہ میں نے اور میرے بعض ساتھیوں نے ایک قریب کے ہوٹل سے کھانا کھالیا تھا۔ پھر وہ خود ہی کہنے لگا کہ البتہ بعض ڈرائیوروں کے پاس کھانے کے پیسے نہیں تھے، وہ ابھی تک بھوکے ہیں، مثال کے طور پر اس نے کئی ڈرائیوروں کا ذکر کیا اور کہنے لگا کہ ''وہ اب اپنے صاحب کو گھر پہنچا کر بس میں اپنے گھر جائیں گے اور بارہ ایک بجے پہنچ کر کھانا کھائیں گے''۔

ایک طرف تو اپنے متعلقین اور ملازمین کے ساتھ (جو درحقیقت گھر ہی کے ایک فرد بن جاتے ہیں) ہماری بے حسی کا عالم یہ ہے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے رزق کی ناقدری اور اضاعت کا حال یہ ہے کہ سیروں کے حساب سے کھانا ہم اپنی پلیٹوں میں اس طرح بچادیتے ہیں کہ وہ کسی دوسرے کے لیے قابل

استعمال نہیں رہتا اور کوڑے کے ڈھیر میں تبدیل ہوجاتا ہے، بالخصوص ایسی بوفے دعوتوں میں جہاں کھانا ایک میز سے اٹھا کر خود لے جانا پڑتا ہے، عموماً ایسے لوگ ایک ہی دفعہ میں زیادہ سے زیادہ کھانا اٹھا کر محض اس لیے لیجاتے ہیں تاکہ بوقت ضرورت دوبارہ کھانا نہ لانا پڑے، لیکن ذرا سی زحمت سے بچنے کے لیے کھانے کی ایک بڑی مقدار بالکل ضائع ہوجاتی ہے۔

ایک طرف میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ بالا واقعے کا تصور کیجیے کہ انہیں انسانوں سے گزر کر کتے بلیوں اور پرندوں اور چیونٹیوں کی بھی فکر ہے اور دوسری طرف ہمارا یہ حال ہے کہ منوں اور سیروں کے حساب سے کھانا ضائع کردینا گوارا ہے، مگر ڈرائیوروں اور ملازمین کے لیے کھانے کا انتظام کرنا گوارا نہیں ؂

بہ بیں تفاوتِ رہ، از کجاست تا بہ کجا؟

کیا ہم تھوڑی سی احتیاط اور دھیان کو کام میں لاکر رزق کی اس بے حرمتی اور اضاعت سے بچنے کا اہتمام نہیں کرسکتے؟ اگر ہم ایسا کرلیں تو کیا بعید ہے کہ اس ذرا سی توجہ کی بدولت مخلوقِ خدا کے کچھ افراد کی بھوک مٹ جائے؟ اور ہم ایک سنگین اجتماعی گناہ سے بچ جائیں۔
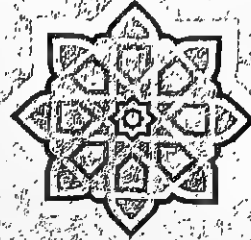
پینے کے آداب

(اصلاحی خطبات: ۵/۲۱۶)
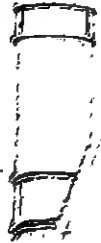
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پینے کے آداب

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَاَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ!

عن أنس رضی اللہ عنہ ”أن رسول الله ﷺ كان يتنفس فى الشراب ثلاثاً يعنی يتنفس خارج الاناء۔“(۱)

وعن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: قال رسول الله ﷺ: «لَا تَشْرَبُوا وَاحِدًا كَشُرْبِ الْبَعِيرِ، وَلٰكِنْ اشْرَبُوا

(۱) صحيح البخاری ۱۱۲/۷ (۵۶۱۳) وصحيح مسلم ۱۶۰۲/۳ (۲۰۲۸) ورياض الصالحين ۲۵۰ (۷۵۷) طبع موسسة الرسالة۔

مَثْنَى وَثُلَاثَ، وَسَمُّوا إِذَا أَنْتُمْ شَرِبْتُمْ، وَاحْمَدُوا إِذَا أَنْتُمْ رَفَعْتُمْ» (١)

پانی پینے کا پہلا ادب

اب تک جن احادیث کا بیان ہوا، ان میں کھانے کے آداب بیان کیے گئے تھے۔ آج جو احادیث آرہی ہیں، ان میں زیادہ تر پینے کے آداب کا بیان ہے۔ اس میں پہلی حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پینے کی چیز کو خواہ وہ پانی ہو یا شربت ہو اس کو تین سانس میں پیا کرتے تھے،'' پھر سانس لینے کی وضاحت آگے کردی کہ پینے کے دوران برتن منہ سے ہٹا کر سانس لیا کرتے تھے۔

دوسری حدیث حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''پینے کی کسی چیز کو اونٹ کی طرح ایک ہی مرتبہ نہ پیا کرو۔'' یعنی ایک ہی سانس میں ایک ہی مرتبہ آدمی غٹ غٹ کر کے پورا گلاس حلق میں انڈیل دے۔ یہ صحیح نہیں ہے اور اس عمل کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کے پینے سے تشبیہ دی، اس لیے کہ اونٹ کی عادت یہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ میں سارا پانی پی جاتا ہے۔ تم اس کی طرح مت پیو، بلکہ تم جب پانی پیو تو یا دو سانس میں پیو یا تین سانس میں پیو اور جب پانی پینا شروع کرو تو اللہ کا نام لے کر اور بسم اللہ پڑھ کر شروع کرو، یہ نہیں کہ محض غٹ غٹ کر کے پانی حلق سے اتار لیا۔

---

(١) سنن الترمذی ٣/٤٥٦ (١٨٨٥) وقال هذا حديث غريب۔

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ کا ایک چھوٹا رسالہ ہے، جس کا نام ہے ''بسم اللہ کے فضائل و مسائل'' اس چھوٹے سے رسالے میں حقائق و معارف کے دریا بند ہیں، اگر انسان پڑھے تو انسان کی آنکھیں کھل جائیں۔ اس میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہی بیان فرمایا ہے کہ یہ پانی جس کو تم نے ایک لمحے کے اندر حلق سے نیچے اتارلیا، اس کے بارے میں ذرا یہ سوچو کہ یہ پانی کہاں تھا؟ اور تم تک کیسے پہنچا؟

پانی خدائی نظام کا کرشمہ

اللہ تعالیٰ نے پانی کا سارا ذخیرہ سمندر میں جمع کر رکھا ہے اور اس سمندر کے پانی کو کھارا بنایا، اس کے لیے اگر اس پانی کو میٹھا بناتے تو کچھ عرصے کے بعد یہ پانی سڑ کر خراب ہوجاتا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس پانی کے اندر ایسے نمکیات رکھے کہ روزانہ لاکھوں جانور اس میں مرجاتے ہیں۔ اس کے باوجود اس میں کوئی خرابی اور کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا۔ اس کا ذائقہ نہیں بدلتا۔ نہ اس کے اندر کوئی سڑان پیدا ہوتی ہے اور پھر اگر تم سے یہ کہا جاتا کہ جب پانی کی ضرورت ہو تو سمندر سے حاصل کرلو اور اس کو پی لو۔ تو انسان کے لیے کتنا دشوار ہوتا، اس لیے کہ اول تو ہر شخص کا سمندر تک پہنچنا مشکل ہے اور دوسری طرف وہ پانی اتنا کھارا ہے کہ ایک گھونٹ بھی حلق سے اتارنا مشکل ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرمایا کہ اس سمندر سے مون سون کے بادل اٹھائے اور پھر عجیب قدرت کا کرشمہ ہے کہ اس بادل کے اندر ایسی آٹومیٹک مشین لگی ہوئی ہے کہ جب وہ بادل سمندر سے اٹھتا ہے تو اس پانی کی ساری نمکیات نیچے رہ جاتی ہیں اور صرف میٹھا پانی اوپر اٹھ کر چلا جاتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا سال

میں ایک مرتبہ بادلوں کے ذریعے سارا پانی برسا دیتے اور یہ فرماتے کہ تم یہ پانی اپنے پاس جمع کرلو۔ اور ذخیرہ کرلو، ہم صرف ایک مرتبہ بارش برسادیں گے، تو اس صورت میں وہ برتن اور ٹنکیاں کہاں سے لاتے جن کے اندر تم اتنا پانی جمع کرلیتے جو تمہارے سال بھر کے لیے کافی ہوجاتا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا کہ

فَاَسْكَنّٰهُ فِى الْاَرْضِ (۱)

یعنی ہم نے پہلے آسمان سے پانی برسایا اور پھر اس کو زمین کے اندر بٹھادیا اور جمع کر دیا۔ اس کو اس طرح بٹھادیا کہ پہلے پہاڑوں پر برسایا اور پھر اس کو برف کی شکل میں وہاں جمادیا اور تمہارے لیے وہاں ایک قدرتی فریزر بنادیا۔ اب پہاڑ کی چوٹیوں پر تمہارے لیے پانی محفوظ ہے اور ضرورت کے وقت وہ پانی پگھل پگھل کر دریاؤں کے ذریعے زمین کے مختلف خطوں میں پہنچ رہا ہے اور پھر دریاؤں سے نہریں اور ندیاں نکالیں اور دوسری طرف زمین کی رگوں کے ذریعے کنوؤں تک پانی پہنچادیا، لہٰذا اب پہاڑوں کی چوٹیوں پر ذخیرہ بھی موجود ہے اور سپلائی لائن بھی موجود ہے اور اس سپلائی کے ذریعے ایک ایک آدمی تک پانی پہنچ رہا ہے۔ اب اگر ساری دنیا کے سائنس دان اور انجینئر مل کر بھی اس طرح پانی کی سپلائی کا انتظام کرنا چاہتے تو انتظام نہیں کرسکتے تھے، لہٰذا جب پانی پیو تو ذرا غور کرلیا کرو کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح اپنی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کے ذریعے یہ پانی کا گلاس تم تک پہنچایا اور اسی بات کی طرف یاددہانی کے لیے کہا جارہا ہے کہ جب پانی پیو بسم اللہ پڑھ کر پیو۔

---

(۱) سورۃ المومنون آیت (۱۸)۔

پوری سلطنت کی قیمت ایک گلاس پانی

بادشاہ ہارون رشید کے پاس ایک مرتبہ ابن السماک آئے۔اسی دوران ہارون رشید نے پانی مانگا، پانی آگیا تو ہارون رشید نے پینا چاہا تو ابن السماک نے کہا: امیر المؤمنین ! ذرا ایک لمحے کے لیے ٹھہر جایئے۔ پہلے یہ بتائیں کہ یہ پانی جو اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے، بالفرض یہ پانی نہ ملتا اور پیاس اتنی شدید ہوتی جتنی اس وقت ہے، تو بتایئے اس ایک گلاس پانی کی کیا قیمت لگاتے اور اس کے حاصل کرنے پر کتنی رقم خرچ کردیتے؟ ہارون رشید نے کہا کہ یہ پیاس تو ایسی چیز ہے کہ اگر انسان کو پانی نہ ملے تو اس کی وجہ سے بیتاب ہوجاتا ہے اورمرنے کے قریب ہوجاتا ہے، اس لیے میں ایک گلاس پانی حاصل کرنے کی خاطر اپنی آدھی سلطنت دے دیتا، اس کے بعد اب ابن السماک نے کہا کہ اب آپ اس پانی کو پی لیں۔ ہارون رشید نے پانی پی لیا، اس کے بعد اس شخص نے ہارون رشید سے کہا کہ امیر المؤمنین! ایک سوال کا جواب اور دے دیں۔ انہوں نے پوچھا کیا سوال ہے؟

اس شخص نے کہا کہ ابھی آپ نے جو ایک گلاس پانی پیا ہے، اگر یہ پانی آپ کے جسم کے اندر رہ جائے اور خارج نہ ہو، پیشاب نہ آئے، پھر اس کو خارج کرنے کے لیے کیا کچھ خرچ کردیں گے؟ ہارون رشید نے جواب دیا کہ یہ تو پہلی مصیبت سے زیادہ بڑی مصیبت ہے کہ پانی اندر جاکر خارج نہ ہو اور پیشاب بند ہوجائے، اس کو خارج کرنے کے لیے پوری سلطنت دے دیتا، اس کے بعد اس شخص نے کہا کہ آپ کی پوری سلطنت کی قیمت صرف ایک گلاس پانی کا اندر لے جانا اور اس کو باہر لانا ہے۔ جس سلطنت کی قیمت ایک گلاس پانی

پینے کی برابر ہو، کیا وہ اس لائق ہے کہ انسان اس کے لیے دوسروں سے مقابلہ کرے، اس پر ہارون رشید رو پڑے (۱)۔

اس لیے یہ جو کہا جارہا ہے کہ بسم اللہ پڑھ کر پانی پیو، اس سے اسی طرف متوجہ کیا جارہا ہے کہ یہ پانی کا گلاس جو تم پی رہے ہو، یہ اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت ہے اور اس توجہ کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس پانی پینے کو تمہارے لیے عبادت بنادیں گے۔

ٹھنڈا پانی، ایک عظیم نعمت

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ میاں اشرف علی! جب بھی پانی پیو، تو ٹھنڈا پیو تاکہ روئیں روئیں سے اللہ تعالیٰ کا شکر نکلے۔ اس لیے کہ جب مومن آدمی ٹھنڈا پانی پیئے گا تو اس کے روئیں روئیں سے اللہ کا شکر نکلے گا، شاید یہی وجہ ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک ارشاد میں آپ کی چند پسندیدہ چیزوں کا ذکر ہے ان میں سے ایک چیز ٹھنڈا پانی ہے (۲)۔

چنانچہ روایات میں کہیں نہیں ملتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے کسی خاص کھانے کا اہتمام کیا جارہا ہو، لیکن ٹھنڈے پانی کا اتنا اہتمام تھا کہ مدینہ سے دو میل کے فاصلے پر ایک کنواں تھا، جس کا نام تھا ''بیر غرس''۔ اس کا پانی بہت ٹھنڈا ہوتا تھا،

---

(۱) تاریخ طبری ۳۵۷/۸ طبع دار التراث بیروت وتاریخ الخلفاء للسیوطی ص ۲۱٦ طبع مکتبة نزار مصطفی الباز۔

(۲) سنن الترمذی ٤٦١/۳ (۱۸۹۵) والمستدرک للحاکم ١٥٣/٤ (۷۲۰۰) وقال: هذا حديث صحيح على شرط الشيخين ولم يخرجاه۔ ووافقه الذهبی فی ''التلخيص''۔

اس کنویں کا پانی خاص طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لایا جاتا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت بھی فرمائی تھی کہ میرے انتقال کے بعد مجھے غسل بھی اسی کنویں کے پانی سے دیا جائے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی ''بیرِ غرس'' کے پانی سے غسل دیا گیا(۱)۔ اس کنویں کے آثار اب بھی باقی ہیں، مگر پانی خشک ہو چکا ہے، الحمد للہ! میں نے اس کنویں کی زیارت کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ٹھنڈے پانی کا اہتمام اس لیے فرماتے تھے کہ جب آدمی ٹھنڈا پانی پیے گا تو روئیں روئیں سے اللہ کا شکر نکلے گا۔

تین سانس میں پانی پینا

ان احادیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی پینے کا ادب بتادیا۔ جس میں سے ایک ادب یہ بھی ہے کہ تین سانس میں پانی پیا جائے۔ اس معنی میں جتنی احادیث مروی ہیں ان کی روشنی میں علماءِ کرام نے فرمایا کہ تین سانس میں پانی وغیرہ پینا افضل ہے اور سنّت کے زیادہ قریب ہے، لیکن دو سانس میں پانی پینا بھی جائز ہے، چار سانس میں پینا بھی جائز ہے، البتہ ایک سانس میں سارا پانی پی جانا خلاف اولیٰ ہے، اور بعض علماء نے لکھا ہے کہ ایک سانس میں پینا طبی طور پر بھی نقصان دہ ہے، واللہ اعلم۔ بہرحال! طبّی طور پر نقصان دہ ہو یا نہ ہو، مگر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے اور تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سانس میں پانی پینے کی جو ممانعت فرمائی ہے وہ حرمت

---

(۱) الطبقات الکبری لابن سعد ۴۳۴/۱ طبع مکتبة الخانجی۔السیرة النبویة لابن کثیر ۵۲۱/۴ طبع دار المعرفة۔وإمتاع الاسماع للمقریزی ۳۵۱/۷ طبع دار الکتب العلمیة۔

والی ممانعت نہیں ہے، یعنی ایک سانس میں پانی پینا حرام نہیں ہے، لہٰذا اگر کوئی ایک سانس میں پانی پی لے گا تو گناہ گار نہ ہوگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مختلف شانیں

بات دراصل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیثیت امت کے لیے مختلف شانیں رکھتی ہیں، ایک حیثیت آپ کی رسول کی ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے احکام لوگوں تک پہنچانے والے ہیں۔ اب اگر اس حیثیت سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی کام سے ممانعت فرمادیں گے تو وہ کام حرام ہوجائے گا اور اس کام کو کرنا گناہ ہوگا اور ایک حیثیت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک شفیق رہنما کی ہے، لہٰذا شفقت کی وجہ سے امت کو کسی کام سے منع فرماتے ہیں کہ یہ کام مت کرو، تو اس کی ممانعت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسا کرنے میں تمہارے لیے نقصان ہے، یہ اچھا اور پسندیدہ کام نہیں ہے، لیکن وہ کام حرام نہیں ہوجاتا۔ لہٰذا اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرے تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس نے گناہ کا کام کیا یا حرام کام کیا، لیکن یہ کہا جائے گا کہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی منشا کے خلاف کام کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پسندیدہ طریقے کے خلاف کیا اور وہ شخص جس کے دل میں حضورِ اقدس سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت ہو وہ صرف حرام کاموں کو ہی نہیں چھوڑتا، بلکہ جو کام محبوبِ حقیقی کو ناپسند ہو، اس کو بھی چھوڑ دیتا ہے۔

پانی پیو، ثواب کماؤ

لہٰذا فقہی طور پر تو میں نے بتادیا کہ ایک سانس میں پانی پینا حرام اور گناہ

نہیں ہے، لیکن ایک محبِّ صادق، جس کے دل میں سرکارِ دو عالم ﷺ کی محبت ہو وہ تو ایسے کاموں کے قریب بھی نہیں جائے گا جو آپ ﷺ کو پسند نہیں، لہٰذا جس کام کے بارے میں آپ ﷺ نے یہ کہہ دیا کہ یہ کام پسندیدہ نہیں ہے، ایک مسلمان کو حتی الامکان اس کے قریب نہیں جانا چاہیے اور اس کو اختیار نہ کرنا چاہیے، اگرچہ کرلینا کوئی گناہ نہیں، لیکن اچھی بات نہیں، اسی لیے علماء نے فرمایا کہ ایک سانس میں پینا خلاف اولیٰ ہے اور بعض علماء نے فرمایا کہ مکروہِ تنزیہی ہے، لہٰذا کیوں خواہ مخواہ ایک سانس پی کر خلاف اولیٰ کا ارتکاب کیا جائے، پانی تو پینا ہی ہے، اس پانی کو اگر تین سانس میں اس نقطہ نظر سے پی لو کہ یہ حضورِ اقدس ﷺ کی سنتِ شریفہ ہے تو یہ پانی پینا تمہارے لیے عبادت بن گیا اور سنّت کے انوار و برکات تمہیں حاصل ہوگئے اور چونکہ ہر سنّت پر عمل کرنے میں انسان اللہ کا محبوب بن جاتا ہے، اس لیے اس وقت آپ کو اللہ کی محبت حاصل ہوگئی۔ اللہ کے محبوب بن گئے، ذرا سی توجہ سے اس پر اتنا بڑا اجروثواب حاصل ہوگیا۔ اب کیوں بے پرواہی میں اس کو چھوڑ دیا جائے؟ لہٰذا اس کو چھوڑنا نہیں چاہیے۔

مسلمان ہونے کی علامت

دیکھیے! ہر ملت و مذہب کے کچھ طریقے اور آداب ہوتے ہیں، جس کے ذریعے وہ ملت پہچانی جاتی ہے، یہ تین سانس میں پانی پینا بھی مسلمان کے شعار اور علامات میں سے ہے، چنانچہ بچپن سے بچے کو سکھایا جاتا ہے کہ بیٹا! تین سانس میں پانی پیو، آج کل تو اس کا رواج ہی ختم ہوگیا کہ اگر بچہ کوئی عمل اسلامی آداب کے خلاف کر رہا ہے تو اس کو ٹوکا جائے کہ بیٹا! اس طرح کرو، اس طرح نہ کرو۔ بعض عشاق کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ اگر پانی کا ایک ہی گھونٹ ہوتا ہے تو

سنّت کی اتباع کے لیے اس ایک گھونٹ کو بھی تین سانس میں پیتے ہیں، تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کا اجر حاصل ہوجائے۔

منہ سے برتن ہٹا کر سانس لو

”عن أبی قتادہ رضی اللہ عنہ أن النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی أن یتنفس فی الاناء.“(۱)

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برتن کے اندر سانس لینے سے منع فرمایا۔

یعنی ایک آدمی پانی پیتے ہوئے برتن کے اندر ہی سانس لے اور سانس لیتے وقت برتن نہ ہٹائے، اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا، ایک اور حدیث میں اس کی تفصیل آئی ہے کہ ایک صاحب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے پانی پیتے وقت بار بار سانس لینے کی ضرورت پیش آتی ہے میں کس طرح سانس لیا کروں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس وقت سانس لینے کی ضرورت ہو، اس وقت جس گلاس یا پیالے کے ذریعے تم پانی پی رہے ہو۔ اس کو اپنے منہ سے الگ کر کے سانس لے لو اور پھر پانی پی لو، لیکن پانی پینے کے دوران برتن اور گلاس کے اندر سانس لینا اور پھنکارے مارنا ادب کے خلاف ہے اور سنّت کے خلاف بھی(۲)۔

---

(۱) صحیح مسلم ۲۲۵/۱ (٤٦٧) ومسند احمد ۳۰۱/۳۷ (۲۲۵۲۲)۔
(۲) سنن الترمذی ٤٥٧/۳ (۱۸۸۷) وقال ھذا حدیث حسن صحیح۔

ایک عمل میں کئی سنتوں کا ثواب

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ سنتوں پر عمل کرنے کی نیت کرنا لوٹ کا مال ہے، مطلب یہ ہے کہ ایک عمل کے اندر جتنی سنتوں کی نیت کرلو گے، اتنی سنتوں کا ثواب حاصل ہوجائے گا۔ مثلاً پانی پیتے وقت یہ نیت کرلو کہ میں تین سانس میں پانی اس لیے پی رہا ہوں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ تین سانس میں پینے کی تھی، اس سنّت کا ثواب حاصل ہوگیا، اسی طرح یہ نیت کر لی کہ میں سانس لیتے وقت برتن کو اس لیے منہ سے ہٹا رہا ہوں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے برتن میں سانس لینے سے منع فرمایا ہے۔ اب دوسری سنّت پر عمل کا بھی ثواب حاصل ہوگیا۔ اس لیے سنتوں کا علم حاصل کرنا ضروری ہے، تاکہ آدمی جب کوئی عمل کرے تو ایک ہی عمل کے اندر جتنی سنتیں ہیں، ان سب کا دھیان اور خیال رکھے اور ان کی نیت کرے تو پھر ہر ہر نیت کے ساتھ ان شاء اللہ مستقل سنّت کا ثواب حاصل ہوجائے گا۔

دائیں طرف سے تقسیم شروع کرو

”عن انس رضی اللہ عنہ أن رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم أتی بلبنٍ قد شیب بماء وعن یمینه اعرابی وعن یساره ابو بکر رضی اللہ عنہ فشرب، ثم اعطی الاعرابی، وقال الایمن فالایمن.“[1]

---

(۱) صحیح البخاری ۱۱۰/۳ (۲۳۵۲) وصحیح مسلم ۱۶۰۳/۳ (۲۰۲۹) و سنن الترمذی ۴٦۰/۳ (۱۸۹۳) وقال هذا حدیث حسن صحیح۔

اس حدیث شریف میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور عظیم ادب بیان فرمایا ہے اور یہ ادب بھی امت مسلمہ کی علامات میں سے ہے اور اس ادب سے بھی ہمارے معاشرے میں غفلت برتی جارہی ہے۔ وہ ادب اس حدیث میں ایک واقعے کے اندر بیان فرمادیا، وہ یہ کہ

ایک شخص حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دودھ لے کر آئے اور اس دودھ میں پانی ملا ہوا تھا، یہ پانی ملانا کوئی ملاوٹ کی غرض سے اور دودھ بڑھانے کی غرض سے نہیں تھا، بلکہ اہل عرب میں یہ بات مشہور تھی کہ خالص دودھ اتنا مفید نہیں ہوتا، جتنا پانی ملا ہوا دودھ مفید ہوتا ہے، اس لیے وہ صاحب دودھ میں پانی ملا کر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دودھ میں سے کچھ پیا، جو دودھ باقی بچا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چاہا کہ حاضرین کو پلا دیں اور اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے داہنی جانب ایک اعرابی، یعنی دیہات کا رہنے والا بیٹھا تھا، جس کو بدو بھی کہتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بائیں جانب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف فرما تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا بچا ہوا دودھ دائیں طرف بیٹھے ہوئے اعرابی کو پہلے عطا فرمادیا اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو نہیں دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتھ میں فرمایا کہ ''الایمن فالایمن'' یعنی جو آدمی دائیں طرف بیٹھا ہو، پہلے اس کا حق ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مقام

آپ اندازہ لگائیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ترتیب کا اتنا خیال فرمایا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ مقام عطا فرمایا

کہ انبیاء علیہم السلام کے بعد اس روئے زمین پر ان سے زیادہ افضل انسان پیدا نہیں ہوا۔ جن کے بارے میں حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ ''صدیق'' وہ انسان ہوتا ہے کہ اگر نبی کسی آئینے کے سامنے کھڑے ہوں تو یہ جو کھڑے ہوئے انسان ہیں یہ تو نبی ہیں اور آئینے میں ان کا جو عکس نظر آرہا ہے، وہ ''صدیق'' ہیں۔ گویا کہ ''صدیق'' وہ ہے جو نبوت کا پورا عکس اور پوری چھاپ لیے ہوئے ہو اور جو صحیح معنیٰ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خلیفہ ہو۔ اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ وہ انسان ہیں کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں اگر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ میری پوری زندگی کے تمام اعمالِ خیر مجھ سے لے لیں اور اس کے بدلے میں وہ ایک رات جو انہوں نے ہجرت کے موقع پر غار کے اندر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ گزاری تھی، وہ مجھے دے دیں، تو بھی سودا سستا رہے گا[1]۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اتنا اونچا مقام عطا فرمایا تھا، لیکن اس بلند مقام کے باوجود حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تقسیم کے وقت دودھ کا پیالہ اعرابی کو دے دیا، ان کو نہیں دیا اور فرمایا: ''الایمن فالایمن'' یعنی تقسیم کے وقت داہنی جانب والا مقدم ہے، بائیں جانب والا مؤخر ہے۔

داہنی جانب باعثِ برکت ہے

اس حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ اصول سکھا دیا کہ اگر مجلس میں لوگ بیٹھے ہوئے ہوں اور کوئی چیز تقسیم کرنی مقصود ہو، مثلاً پانی پلانا ہو یا کھانے

(۱) فضائل الصحابہ لاحمد بن حنبل ۲۹۰/۱ (۳۸۱) طبع موسسہ الرسالہ۔ والمستدرک للحاکم ۷/۳ (٤٢٦٨) وقال: ھذا حدیث صحیح الإسناد علی شرط الشیخین، لولا إرسال فیہ ولم یخرجاہ. وقال الذھبی فی "التلخیص": صحیح مرسل.

کی کوئی چیز تقسیم کرنی ہو یا چھوارے تقسیم کرنے ہوں، اس میں ادب یہ ہے کہ دائیں جانب والوں کو دے اور پھر بائیں جانب تقسیم کرے۔ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے دائیں جانب کو بہت اہمیت دی ہے، دائیں جانب کو عربی میں ''یمین'' کہتے ہیں اور یمین کے معنی عربی زبان میں مبارک کے بھی ہوتے ہیں، اس لیے دائیں جانب کام کرنے میں برکت ہے۔ اس لیے حضورِ اقدس ﷺ نے فرمایا کہ دائیں ہاتھ سے کھاؤ، دائیں ہاتھ سے پانی پیو، دایاں جوتا پہلے پہنو، چلنے میں راستے کے دائیں جانب چلو، یہاں تک حضورِ اقدس ﷺ اپنے بالوں میں کنگھی کرتے تو پہلے دائیں جانب کے بالوں میں کنگھی کرتے، پھر بائیں جانب کرتے، دائیں کا اتنا اہتمام فرماتے، لہٰذا دائیں جانب سے ہر کام شروع کرنے میں برکت بھی ہے اور سنّت بھی ہے[1]۔

داہنی جانب کا اہتمام

ایک اور حدیث میں یہی مضمون آیا ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ کی خدمت میں پینے کی کوئی چیز لائی گئی، آپ ﷺ نے اس میں کچھ پی لیا، کچھ بچ گیا، اس وقت مجلس میں دائیں جانب ایک نوعمر لڑکا بیٹھا تھا اور بائیں جانب بڑے بڑے لوگ بیٹھے تھے، جو عمر میں بڑے تھے، علم اور تجربے میں بھی زیادہ تھے، اب حضورِ اقدس ﷺ نے سوچا کہ ادب اور اصول کا تقاضہ تو یہ ہے کہ یہ پینے کی چیز اس چھوٹے لڑکے کو دے دی جائے، لیکن بائیں جانب بڑے بڑے مشائخ بیٹھے تھے، ان کے درجے اور مرتبے کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کو

---

(۱) صحیح البخاری ۱/۹۳ (٤٢٦) وصحیح مسلم ۱/۲۲٦ (٢٦٨)۔

ترجیح دی جائے، چنانچہ آپ ﷺ نے اس نوجوان لڑکے سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ تمہارے بائیں جانب بڑے بڑے لوگ بیٹھے ہیں، اب حق تمہارا بنتا ہے کہ تمہیں دیا جائے، اس لیے کہ تم دائیں جانب ہو، لیکن بائیں جانب تمہارے بڑے بیٹھے ہیں۔ اگر تم اجازت دو تو میں ان کو دے دوں؟ وہ لڑکا بھی بڑا سمجھ دار تھا۔ اس نے کہا کہ یا رسول اللہ! اگر کوئی اور چیز ہوتی تو میں ضرور ان بڑوں کو اپنے آپ پر ترجیح دے دیتا، لیکن یہ آپ کا بچا ہوا ہے اور آپ کے بچے ہوئے پر میں کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا، لہٰذا اگر میرا حق بنتا ہے تو آپ مجھے ہی عطا فرمائیں۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ وہ چیز اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے فرمایا کہ لو! تم ہی پی لو۔ یہ نوجوان حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما تھے۔ (۱)

دیکھیے! حضورِ اقدس ﷺ نے دائیں جانب کا اتنا اہتمام فرمایا، حالانکہ بائیں جانب بڑے بڑے لوگ بیٹھے ہیں اور خود آپ ﷺ کی بھی یہی خواہش ہے کہ یہ چیز ان بڑوں کو مل جائے، لیکن آپ ﷺ نے اس قاعدے اور اس اصول کے خلاف نہیں کیا کہ دائیں جانب سے شروع کیا جائے۔ اب دن رات ہمارے ساتھ اس قسم کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ مثلاً گھر میں لوگ بیٹھے ہیں، ان کے درمیان کوئی چیز تقسیم کرنی ہے یا مثلاً دسترخوان پر برتن لگاتے ہیں یا کھانا تقسیم کرنا ہے، اس میں اگر ہم اس بات کا اہتمام کریں کہ دائیں جانب سے شروع کریں اور حضورِ اقدس ﷺ کی سنت پر عمل کرنے کی نیت کرلیں، پھر دیکھیں اس میں کتنی برکت اور کتنا نور معلوم ہوگا۔

---

(۱) صحیح البخاری ۱۰۹/۳ (۲۳۵۱) وصحیح مسلم ۱۶۰۴/۳ (۲۰۳۰)۔

بہت بڑے برتن سے منہ لگا کر پانی پینا

”عن أبی سعید الخدری رضی اللہ عنہ قال: نہی رسول اللّٰہ ﷺ عن اختناث الاسقیة، یعنی أن تکسر افواھھا ویشرب منھا۔“(۱)

اس حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک اور ادب بیان فرمادیا۔ چنانچہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع فرمایا کہ مشکیزوں کے منہ کاٹ کر پھر اس سے منہ لگا کر پانی پیا جائے۔

اس زمانے میں پانی بڑے بڑے مشکیزوں میں بھر کر رکھا جاتا تھا، جیسے کہ آج کل بڑے بڑے گیلن ہوتے ہیں، ان سے منہ لگا کر پانی پینے سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا۔

ممانعت کی دو وجہ

علماء نے فرمایا کہ اس ممانعت کی دو وجہ ہیں، ایک وجہ یہ ہے کہ اس مشکیزے یا گیلن کے اندر بڑی مقدار میں پانی بھرا ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ پانی کے اندر کوئی نقصان دہ چیز پڑی ہوئی ہو، جس کی وجہ سے پانی خراب ہوگیا ہو یا نقصان دہ ہوگیا ہو۔ جیسے بعض اوقات کوئی جانور یا کیڑا وغیرہ گر کر پانی میں مرجاتا ہے، اب نظر تو نہیں آرہا ہے کہ اندر کیا ہے تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ منہ لگا کر پانی پینے کے نتیجے میں کوئی خطرناک چیز حلق میں نہ چلی جائے یا پانی

(۱) صحیح البخاری ۱۱۲/۷ (۵۶۲۵) وصحیح مسلم ۱۶۰۰/۳ (۲۰۲۳)۔

ناپاک اور نجس نہ ہوگیا ہو، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح منہ لگا کر پینے سے منع فرمایا۔

دوسری وجہ علماء نے یہ بیان فرمائی کہ جب آدمی اتنے بڑے برتن سے منہ لگا کر پانی پیے گا تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ ایک دم سے بہت سا پانی منہ میں آجائے، اور اس کے نتیجے میں اُچّھو لگ جائے، پھندا لگ جائے یا کوئی اور تکلیف ہوجائے۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع فرمایا۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنی امت پر شفقت

لیکن جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن باتوں سے منع فرماتے ہیں، ان میں سے بعض باتیں وہ ہوتی ہیں جو حرام اور گناہ ہوتی ہیں اور بعض باتیں وہ ہوتی ہیں جو حرام اور گناہ نہیں ہوتی، لیکن حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم پر شفقت کرتے ہوئے اور ادب سکھاتے ہوئے اس سے منع فرماتے ہیں اور جس کام کو آپ شفقت کی وجہ سے منع فرماتے ہیں۔ جب کہ وہ کام حرام اور گناہ نہیں ہوتا، اس کی علامت یہ ہوتی ہے کہ کبھی کبھار زندگی میں آپ اس کام کو کر کے بھی دکھا دیتے ہیں، تاکہ لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ یہ کام حرام اور ناجائز نہیں ہے، لیکن ادب کے خلاف ہے۔ چنانچہ احادیث میں آتا ہے کہ حضور اکرم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دو مرتبہ مشکیزے سے منہ لگا کر پانی پیا۔ علماء نے فرمایا کہ ان تمام برتنوں کا بھی یہی حکم ہے، جو بڑے ہوں، ان میں زیادہ مقدار میں پانی آتا ہو۔ جیسے بڑا کنستر ہے یا مٹکا ہے ان سے بھی منہ لگا کر پانی نہیں پینا چاہیے، البتہ ضرورت داعی ہوجائے تو الگ بات ہے، چنانچہ اگلی حدیث میں اس

کی وضاحت آرہی ہے۔

مشکیزے سے منہ لگا کر پانی پینا

"عن ام ثابت كبشة بنت ثابت اخت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ قالت: دخلت على رسول الله ﷺ فشرب فى قربة معلقة قائماً فقمت الى فيها فقطعته۔"(۱)

حضرت کبشہ بنت ثابت رضی اللہ عنہا جو کہ حضرت سیدنا حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی بہن ہیں، وہ فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم ہمارے گھر تشریف لائے۔ ہمارے گھر میں ایک مشکیزہ لٹکا ہوا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھڑے ہوکر اس مشکیزے سے منہ لگا کر پانی پیا۔

اس عمل کے ذریعے آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے بتادیا کہ اس طرح مشکیزہ سے منہ لگا کر پینا کوئی حرام نہیں ہے۔ صرف تم پر شفقت کرتے ہوئے ایک مشورے کے طور پر یہ حکم دیا گیا ہے۔ حضرت کبشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب آپ چلے گئے تو میں کھڑی ہوئی اور مشکیزے کے جس حصے سے منہ لگا کر آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے پانی پیا تھا، اس حصے کو کاٹ کر وہ چمڑا اپنے پاس رکھ لیا۔

---

(۱) سنن الترمذی ٤٦٠/٣ (١٨٩٢) وقال: هذا حديث حسن صحيح غريب۔ وسنن ابن ماجه ١٠٦/٥ (٣٤٢٣)۔

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہونٹ جس کو چھولیں

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں ایک ایک صحابی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جاں نثار، عاشق زار، فداکار تھے۔ ایسے فداکار اور جاں نثار کسی اور ہستی کے نہیں مل سکتے، جیسے کہ آپ نے اوپر دیکھا کہ حضرت کبشہ رضی اللہ عنہا نے اس مشکیزہ کا منہ کاٹ کر اپنے پاس رکھ لیا اور فرمایا کہ یہ وہ چمڑا ہے جس کو نبی کریم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک ہونٹ چھوئے ہیں اور آئندہ کسی اور کے ہونٹ اس کو نہیں چھونے چاہئیں اور اب یہ چمڑا اس لیے نہیں ہے کہ اس کو مشکیزے کے طور پر استعمال کیا جائے، بلکہ یہ تو تبرک کے طور پر رکھنے کے قابل ہے، اس لیے اس کو کاٹ کر تبرک کے طور پر اپنے گھر میں رکھ لیا۔

یہ بال متبرک ہوگئے

حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں، جن کو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ مکرمہ کا موذن مقرر فرمایا تھا۔ جس وقت یہ مسلمان ہوئے تھے، اس وقت یہ چھوٹے بچے تھے اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شفقت سے ان کے سر پر ہاتھ رکھا، جس طرح چھوٹے بچوں کے سر پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ چنانچہ ابو محذورہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس مقام پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے سر پر ہاتھ رکھا تھا، ساری عمر اس جگہ کے بال نہیں کٹوائے اور فرماتے تھے کہ یہ وہ بال ہیں جس کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک چھوئے ہیں۔ (۱)

---

(۱) مصنف عبدالرزاق ۱/۴۵۷(۱۷۷۹) ومسند احمد ۲۴/۹۱(۱۵۳۷۶) سنن ابی داود ۱/۱۳۶(۵۰۱).

تبرکات کی حیثیت

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی چیز تبرک کے طور پر رکھنا یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ، تابعین، بزرگانِ دین، اولیاءِ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی کوئی چیز تبرک کے طور پر رکھ لینے میں کوئی حرج نہیں۔ آج کل اس بارے میں لوگوں کے درمیان افراط وتفریط پایا جاتا ہے، بعض لوگ ان تبرکات سے بہت چڑتے ہیں، اگر ذرا سی تبرک کے طور پر کوئی چیز رکھ لی، تو ان کے نزدیک وہ شرک ہوگیا اور بعض لوگ وہ ہیں جو تبرکات ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حق ان دونوں کے درمیان ہے۔ نہ تو انسان یہ کرے کہ تبرک کو شرک کا ذریعہ بنالے اور نہ ہی تبرک کا ایسا انکار کرے کہ بے ادبی تک پہنچ جائے، جس چیز کو اللہ والوں کی نسبت ہوجائے، اللہ تعالیٰ اس میں برکتیں نازل فرماتے ہیں، ایک واقعہ تو آپ نے ابھی سن لیا تھا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مشکیزے کی جس جگہ سے منہ لگا کر پانی پیا تھا ان صحابیہ نے اس کو کاٹ کر اپنے پاس رکھ لیا۔

متبرک دراہم

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کو ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے چاندی کے درہم عطا فرمائے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ان دراہم کو ساری عمر خرچ نہ کیا اور فرماتے کہ یہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عطا فرمودہ ہیں، وہ اٹھا کر رکھ دیے۔ حتی کہ اولاد کو وصیت کر کے گئے کہ یہ دراہم حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عطا کردہ ہیں ان کو خرچ مت کرنا، بلکہ تبرک کے طور پر ان کو گھر میں رکھنا۔ چنانچہ ایک عرصہ دراز تک وہ دراھم ان کے خاندان میں چلتے رہے، ایک دوسرے کی طرف منتقل

ہوتے رہے۔ حتیٰ کہ کسی ہنگامے کے موقع پر وہ ضائع ہوگئے۔ (۱)

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مبارک پسینہ

حضرت امِ سلیم رضی اللہ عنہا ایک صحابیہ ہیں، وہ فرماتی ہیں کہ میں نے دیکھا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک جگہ سورہے ہیں، گرمی کا موسم تھا اور عرب میں بہت سخت گرمی پڑتی تھی۔ اس لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسم مبارک سے پسینہ بہہ کر زمین پر گر رہا تھا۔ چنانچہ میں نے ایک شیشی لاکر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پسینہ مبارک اس میں محفوظ کرلیا۔ وہ فرماتی ہیں کہ وہ پسینہ اتنا خوشبو دار تھا کہ مشک و زعفران اس کے آگے ہیچ تھے اور پھر میں نے اس کو اپنے گھر میں رکھ لیا اور جب گھر میں خوشبو استعمال کرتی تو اس میں تھوڑا سا پسینہ شامل کرلیتی۔ ایک عرصہ دراز تک میں نے اس کو اپنے پاس محفوظ رکھا۔ (۲)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک بال

ایک صحابیہ رضی اللہ عنہا کو کہیں سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بال مل گئے، وہ فرماتی ہیں کہ میں نے ان بالوں کو ایک شیشی کے اندر ڈال کر اس میں پانی بھر دیا اور پھر جب قبیلے میں کوئی بیمار ہوتا، تو اس پانی کا ایک قطرہ دوسرے پانی میں ملا کر اس بیمار کو پلا دیتے تو اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ شفاء عطا فرمادیتے۔ (۳)

---

(۱) صحیح البخاری ۱۰۰/۳ (۲۳۰۹) و صحیح مسلم ۱۲۲۲/۳ (۷۱۵)۔

(۲) صحیح البخاری ۶۳/۸ (۶۲۸۱) و صحیح مسلم ۱۸۱۵/٤ (۲۳۳۱)۔

(۳) صحیح البخاری ۱۶۰/۷ (۵۸۹۶)۔

بہرحال! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس طریقے سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تبرکات کا احترام کیا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تبرکات

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ جاتے ہوئے راستے میں جس جگہ پر ایسی منزل آتی، جہاں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گزرتے ہوئے کبھی قیام فرمایا تھا، تو وہاں میں اترتا اور دو رکعت نفل ادا کرلیتا اور پھر آگے روانہ ہوتا۔ (۱)

بہرحال! اس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تبرکات کو باقی رکھنے اور محفوظ رکھنے کا بہت اہتمام فرمایا، لیکن حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم تبرکات کی حقیقت سے بھی واقف تھے، ان تبرکات میں غلو، مبالغہ یا افراط وتفریط کا ان سے کوئی امکان نہیں تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ انہی تبرکات کو وہ سب کچھ سمجھ بیٹھتے، انہی کو مشکل کشا یا حاجت روا سمجھ بیٹھتے یا ان تبرکات کو شرک کا ذریعہ بنا لیتے یا ان تبرکات کی پرستش شروع کردیتے۔

بت پرستی کی ابتداء

عرب میں بت پرستی کا رواج بھی درحقیقت ان تبرکات میں غلو کے نتیجے میں شروع ہوا تھا، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا نے مکہ مکرمہ میں بیت اللہ کے پاس قیام کیا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام وہیں پلے بڑھے، جوان

(۱) صحیح البخاری ۱۰۴/۱ (۴۸۳)۔

ہوئے اور پھر بنی جرہم کے لوگ وہاں آکر آباد ہوگئے۔ جس کے نتیجے میں مکہ مکرمہ کی بستی آباد ہوگئی، بعد میں بنی جرہم کی ایک دوسرے قبیلے والوں سے لڑائی ہوگئی۔ لڑائی کے نتیجے میں دوسرے قبیلے والوں نے بنی جرہم کو مکہ مکرمہ سے نکال دیا۔ چنانچہ بنی جرہم کے لوگ وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے۔ جب ہجرت کرکے جانے لگے تو یادگار کے طور پر کسی نے مکہ مکرمہ کی مٹی اٹھالی، کسی نے پتھر اٹھالیے، کسی نے بیت اللہ کے آس پاس کی کوئی اور چیز اٹھالی، تاکہ یہ چیزیں ہم اپنے پاس تبرک اور یادگار کے طور پر رکھیں گے اور ان کو دیکھ کر ہم بیت اللہ شریف اور مکہ کو یاد کریں گے، جب دوسرے علاقے میں جاکر قیام کیا تو وہاں پر بڑے اہتمام سے ان تبرکات کی حفاظت کرتے تھے، لیکن رفتہ رفتہ جب پرانے لوگ رخصت ہوگئے اور کوئی صحیح راستہ بتانے والا باقی نہ رہا تو بعد کے لوگوں نے رفتہ رفتہ اس مٹی اور پتھروں سے کچھ صورتیں بنالیں اور وہ صورتیں بتوں کی شکل میں تیار ہوگئیں اور پھر انہی کی پرستش شروع کردی، اہلِ عرب کے اندر یہیں سے بت پرستی کا آغاز ہوا۔(۱)

تبرکات میں اعتدال ضروری ہے

بہرحال! اللہ تعالیٰ بچائے۔ آمین۔ اگر ان تبرکات کا احترام حد کے اندر نہ ہوتو پھر شرک اور بت پرستی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اس لیے تبرکات کے معاملے میں بڑے اعتدال کے ساتھ چلنے کی ضرورت ہے۔ نہ تو ان کی بے ادبی ہو اور نہ ہی ایسی تعظیم ہو، جس کے نتیجے میں انسان شرک میں مبتلا ہوجائے یا شرک کی سرحدوں کو چھونے لگے۔ تبرکات کی حقیقت یہ ہے کہ برکت کے لیے

---

(۱) البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر ۱۸۷/۳ طبع دار ھجر۔

اس کو اپنے پاس رکھ لے، اس لیے کہ جب ایک چیز کو کسی بزرگ کے ساتھ نسبت ہوگی تو اس نسبت کی بھی قدر کرنی چاہیے، اس کی نسبت کی بھی تعظیم اور ادب کرنا چاہیے۔ مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

> ''میں مدینہ منورہ کے ساتھ نسبت رکھنے والے کتے کا بھی احترام کرتا ہوں اس لیے کہ اس کتے کو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شہر کے ساتھ نسبت حاصل ہے۔''

یہ سب عشق کی باتیں ہوتی ہیں کہ محبوب کے ساتھ کسی چیز کو ذرا سی بھی نسبت ہوگئی تو اس کا ادب اور احترام کیا اور جب نسبت کی وجہ سے کوئی شخص تعظیم کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر اجر وثواب عطا فرماتے ہیں کہ اس نے میرے محبوب کی نسبت کی بھی قدر کی، بشرطیکہ حدود میں رہے، حد سے آگے نہ بڑھے۔ یہ بات ہمیشہ سمجھنے اور یاد رکھنے کی ہے، اس لیے کہ لوگ بکثرت افراط وتفریط کی باتیں کرتے ہیں اور اس کی وجہ سے پریشانی کا شکار ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اعتدال میں رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

بیٹھ کر پانی پینا سنّت ہے

> ''عن انس رضی اللہ عنہ أن النبی ﷺ أنه نهى أن يشرب الرجل قائمًا''۔(۱)
>
> حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھڑے ہوکر پانی پینے سے منع فرمایا ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم ۳/۱۶۰۰ (۲۰۲٤) وسنن ابی داود ۳/۳۳٦ (۳۷۱۷)۔

اس حدیث کی بنیاد پر علماء نے فرمایا ہے کہ حتی الامکان کھڑے ہوکر پانی نہ پینا چاہیے اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت شریفہ یعنی عام عادت یہ تھی کہ آپ بیٹھ کر پانی پیتے تھے۔ اس لیے کھڑے ہوکر پانی پینا مکروہِ تنزیہی ہے، مکروہ تنزیہی کا مطلب یہ ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہوکر پانی پینے کو ناپسند فرمایا۔ اگرچہ کوئی شخص کھڑے ہوکر پانی پی لے تو کوئی گناہ نہیں، حرام نہیں، لیکن خلافِ ادب اور خلافِ اولیٰ ہے اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ناپسندیدہ ہے۔

کھڑے ہوکر پینا بھی جائز ہے

یہ بات بھی سمجھ لیں کہ جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز سے منع فرمایا، جب کہ وہ چیز حرام اور گناہ نہیں ہے تو ایسے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بتانے کے لیے کبھی کبھار خود بھی وہ عمل کر کے دکھادیا، تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ عمل گناہ اور حرام نہیں، چنانچہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی مرتبہ کھڑے ہوکر پانی پینا بھی ثابت ہے [1]۔ ابھی میں آپ کو حضرت کبشہ رضی اللہ عنہا کے مشکیزے سے پانی پینے کا واقعہ سنایا۔ وہ مشکیزہ دیوار کے ساتھ لٹکا ہوا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہوکر منہ لگا کر اس سے پانی پیا، اسی وجہ سے علماء نے فرمایا کہ اگر کوئی جگہ ایسی ہے جہاں بیٹھنے کی گنجائش نہیں ہے، ایسے موقع پر اگر کوئی شخص کھڑے ہوکر پانی پی لے تو کوئی مضائقہ نہیں، بلا کراہت جائز ہے اور بعض اوقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف یہ بتانے کے لیے کھڑے ہوکر پانی پیا کہ کھڑے ہوکر پانی پینا بھی جائز ہے، چنانچہ حضرت نزال بن سبرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک

---

(۱) ملاحظہ ہو صحیح البخاری ۱۵۶/۲ (۱۶۳۷) و ۱۱۰/۷ (۵۶۱۷) و صحیح مسلم ۱۶۰۱/۳ (۲۰۲۷)

مرتبہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ "باب الرحبة" میں تشریف لائے، "باب الرحبة" کوفہ کے اندر ایک جگہ کا نام ہے۔ وہاں پر کھڑے ہوکر آپ نے پانی پیا اور فرمایا کہ

"أني رأيت رسولَ الله ﷺ فعل كما رأيتموني فعلت"(۱)

یعنی میں نے حضور اکرم ﷺ کو اسی طرح کرتے ہوئے دیکھا جس طرح تم نے مجھے دیکھا کہ میں کھڑے ہوکر پانی پی رہا ہوں۔ بہرحال! کبھی کبھی حضورِ اقدس ﷺ نے کھڑے ہوکر پانی پی کر یہ بتادیا کہ یہ عمل گناہ نہیں۔

بیٹھ کر پینے کی فضیلت

لیکن اپنی امت کو جس کی تعلیم دی اور جس کی تاکید فرمائی اور جس پر ساری عمر عمل فرمایا وہ یہ تھا کہ حتی الامکان بیٹھ کر ہی پانی پیتے تھے، اس لیے یہ بیٹھ کر پانی پینا حضورِ اقدس ﷺ کی اہم سنتوں میں سے ہے اور جو شخص اس کا جتنا اہتمام کرے گا۔ ان شاء اللہ اس پر اجر و ثواب اور اس کی فضیلت اور برکات حاصل ہوں گی، اس لیے خود بھی اس کا اہتمام کرنا چاہیے اور دوسروں سے بھی اس کا اہتمام کرانا چاہیے، اپنے گھر والوں کو بتانا چاہیے، اپنے بچوں کو اس کی تعلیم دینی چاہیے اور بچوں کے دل میں یہ بات بٹھانی چاہیے کہ جب بھی پانی پیو تو بیٹھ کر پیو۔ اگر انسان اس کی عادت ڈال لے تو مفت کا ثواب حاصل ہوجائے گا۔ اس لیے کہ اس عمل میں کوئی خاص محنت اور مشقت نہیں ہے۔ اگر آپ پانی

---

(۱) صحیح البخاری ۷/۱۱۰ (۵۶۱۵-۵۶۱۶)۔

کھڑے ہوکر پینے کے بجائے بیٹھ کر پی لیں تو اس میں کیا حرج اور کیا مشقت لازم آجائے گی؟ لیکن جب سنّت کی اتباع کی نیت کر کے پانی بیٹھ کر پی لیا تو اتباعِ سنّت کا عظیم اجروثواب حاصل ہوجائے گا۔

سنّت کی عادت ڈال لو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبد الحیٔ صاحب رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ میں ایک مسجد میں نماز پڑھنے کے لیے گیا، وہاں پانی پینے کی ضرورت پیش آئی، مسجد میں مٹکے رکھے تھے، میں نے مٹکے سے پانی نکالا اور اپنی عادت کے مطابق ایک جگہ بیٹھ کر پانی پینے لگا، ایک صاحب یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے، وہ قریب آئے اور کہا: یہ آپ نے بیٹھنے کا اتنا اہتمام کیا، اس کی کیا ضرورت تھی؟ کھڑے ہوکر ہی پی لیتے'' میں نے سوچا اب میں ان سے کیا بحث کروں، میں نے کہا کہ اصل میں ہمیشہ سے بیٹھ کر پینے کی عادت پڑی ہوئی ہے، اس شخص نے کہا کہ یہ آپ نے عجیب بات فرمائی کہ عادت پڑگئی، ارے سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت پڑجانا کوئی معمولی بات ہے؟ بہرحال! عادتیں تو انسان بہت سی ڈال لیتا ہے، لیکن جب عادت ڈالے تو سنّت کی عادت ڈالے، تاکہ اس پر اجروثواب بھی حاصل ہوجائے۔

نیکی کا خیال اللہ کا مہمان ہے

ہمارے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب جلال آبادی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب دل میں کسی نیک کام کرنے یا کسی سنّت پر عمل کرنے کا خیال آئے تو اس ''خیال'' کو صوفیاءِ کرام ''وارد'' کہتے ہیں۔ یہ ''وارد'' اللہ تعالیٰ کی طرف سے

بھیجا ہوا مہمان ہے، اس مہمان کا اکرام کرو اور اس کی قدر پہچانو، مثلاً جب آپ نے کھڑے ہوکر پانی پینا شروع کیا تو اس وقت دل میں خیال آیا کہ کھڑے ہو کر پانی پینا اچھا نہیں ہے، سنّت کے خلاف ہے، بیٹھ کر پانی پینا چاہیے۔ اگر آپ نے اس خیال اور ''وارد'' کا اکرام کرتے ہوئے بیٹھ کر پانی پی لیا تو یہ مہمان بار بار آئے گا، آج اس نے تمہیں بٹھا کر پانی پلا دیا تو کل کسی اور سنّت پر عمل کرائے گا، اس طرح یہ تمہاری نیکیوں میں اضافہ کراتا چلا جائے گا، لیکن اگر تم نے اللہ تعالیٰ کے اس مہمان کی ناقدری کی۔ مثلاً پانی پیتے وقت بیٹھ کر پانی پینے کا خیال آیا تو تم نے فوراً اس خیال کو یہ کہہ کر جھٹک دیا کہ بیٹھ کر پانی پینا کون سا فرض و واجب ہے، کھڑے ہوکر پیناہ گناہ تو ہے نہیں۔ چلو کھڑے کھڑے پانی پی لو۔ اب تم نے اس مہمان کی ناقدری کی اور اس کو واپس بھیج دیا اور اگر چند مرتبہ تم نے اس کی اس طرح ناقدری کی تو پھر یہ آنا بند کردے گا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دل سیاہ ہوگیا ہے اور دل پر مہر لگ گئی ہے، جس کے نتیجے میں اب نیکی کا خیال بھی نہیں آتا، بلکہ بدی اور گناہ کے خیالات آتے ہیں۔ اس لیے کہ جب کبھی اتباعِ سنّت کا خیال آئے تو فوراً اس پر عمل کرلو۔ شروع شروع میں تھوڑی تکلیف ہوگی، لیکن آہستہ آہستہ جب عادت پڑ جائے گی، تو پھر آسان ہوجائے گا۔

زمزم کا پانی کس طرح پیا جائے؟

عن ابن عباس رضي الله عنه قال: ''سقيت النبي ﷺ من زمزم، فشرب وهو قائم.''(۱)

---

(۱) صحیح البخاری ۲/۱۵۶ (۱۶۳۷) و ۷/۱۱۰ (۵۶۱۷) وصحیح مسلم ۳/۱۶۰۱ (۲۰۲۷)۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو زمزم کا پانی پلایا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر زمزم پیا۔

اس حدیث کی وجہ سے بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ زمزم کا پانی بیٹھ کر پینے کے بجائے کھڑے ہو کر پینا افضل اور بہتر ہے، چنانچہ یہ بات مشہور ہے کہ دو پانی ایسے ہیں جو کھڑے ہو کر پینے چاہئیں۔ ایک زمزم کا پانی اور ایک وضو کا بچا ہوا پانی، اس لیے کہ وضو سے بچا ہوا پانی پینا بھی مستحب ہے[1]، لیکن دوسرے علماء یہ فرماتے ہیں کہ افضل یہ ہے کہ دونوں پانی بھی بیٹھ کر پینے چاہئیں، جہاں تک حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی اس حدیث کا تعلق ہے کہ اس میں حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے زمزم کا پانی کھڑے ہو کر پیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک طرف تو زمزم کا کنواں اور دوسرے اس پر لوگوں کا ہجوم اور پھر کنویں کے چاروں طرف کیچڑ، قریب میں کہیں بیٹھنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر پانی پی لیا، لہٰذا اس حدیث سے یہ لازم نہیں آتا کہ زمزم کا پانی کھڑے ہو کر پینا افضل ہے۔

زمزم اور وضو کا بچا ہوا پانی بیٹھ کر پینا افضل ہے

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق یہی تھی کہ زمزم کا پانی بیٹھ کر پینا ہی افضل ہے۔ اسی طرح وضو کا بچا ہوا پانی بھی بیٹھ کر پینا افضل ہے، البتہ عذر کے مواقع پر جس طرح عام پانی کھڑے ہو کر پینا جائز

---

(۱) ملاحظہ ہو صحیح البخاری ۱۱۰/۷ (۵۶۱۶)۔

ہے۔ اسی طرح زمزم اور وضو سے بچا ہوا پانی بھی کھڑے ہوکر پینا جائز ہے۔ عام طور پر لوگ یہ کرتے ہیں کہ اچھے خاصے بیٹھے ہوئے تھے، لیکن جب زمزم کا پانی دیا گیا تو ایک دم سے کھڑے ہوگئے اور کھڑے ہوکر اس کو پیا، اتنا اہتمام کرکے کھڑے ہوکر پینے کی ضرورت نہیں، بلکہ بیٹھ کر پینا چاہیے، وہی افضل ہے۔

کھڑے ہوکر کھانا

عن أنس بن مالك رضي الله عنه أن النبي صلى الله عليه وسلم "نهى أن يشرب الرجل قائمًا قال قتادة: فقلنا لأنس فالأكل؟ قال: ذلك اشر اَو اخبث."(١)

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھڑے ہوکر پانی پینے سے منع فرمایا۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کھڑے ہوکر کھانے کا کیا حکم ہے؟ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "کھڑے ہوکر کھانا تو اس سے بھی زیادہ برا اور اس سے بھی زیادہ خبیث ہے"۔

یعنی کھڑے ہوکر پانی پینے کے مقابلے میں کھڑے ہوکر کھانا اس سے زیادہ برا ہے۔ چنانچہ اسی حدیث کی بنیاد پر بعض علماء نے فرمایا کہ کھڑے ہوکر پانی پینا مکروہِ تنزیہی ہے اور کھڑے ہوکر کھانا مکروہِ تحریمی اور ناجائز ہے۔ اس لیے کہ

---

(١) صحیح مسلم ٣/١٦٠٠(٢٠٢٤)۔

کھڑے ہوکر کھانے کو حضرت انس رضی اللہ عنہ نے زیادہ خبیث اور برا طریقہ فرمایا۔

کھڑے ہوکر کھانے سے بچیے

بعض لوگ کھڑے ہوکر کھانے کے جواز پر حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں انہوں نے فرمایا کہ ہم حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چلتے ہوئے بھی کھالیتے تھے اور کھڑے ہوکر پانی پی لیتے تھے[1]۔ یہ حدیث لوگوں کو بہت یاد رہتی ہے، اور اس کی بنیاد پر یہ کہتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کھڑے ہوکر کھالیتے تھے تو ہمیں کھڑے ہوکر کھانے سے کیوں منع کیا جارہا ہے؟

خوب سمجھ لیں! ابھی آپ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث سن لی کہ کھڑے ہوکر کھانا زیادہ خبیث اور زیادہ برا طریقہ ہے، یعنی ایسا کرنا ناجائز ہے، اس حدیث سے مراد وہ کھانا ہے جو باقاعدہ کھایا جاتا ہے۔ جہاں تک حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث کا تعلق ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز جس کو باقاعدہ بیٹھ کر دسترخوان بچھا کر نہیں کھایا جاتا، بلکہ کوئی چھوٹی سی معمولی سی چیز ہے۔ مثلاً چاکلیٹ ہے یا چھوارا ہے یا بادام وغیرہ ہے یا کوئی پھل چکھنے کے طور پر کھالیا، اس میں چلتے پھرتے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن جہاں تک دوپہر کے کھانے اور رات کے کھانے، لنچ اور ڈنر کا تعلق ہے کہ ان کو کھڑے ہوکر کھانا اور کھڑے ہوکر کھانے کا باقاعدہ اہتمام کرنا کسی طرح جائز نہیں۔ آج

---

(۱) سنن ابن ماجہ ۳٤/۵ (۳۳۰۱) وسنن الترمذی ۳٤/۵ (۳۳۰۱) وقال: ھذا حدیث صحیح غریب، من حدیث عبید اللہ بن عمر، عن نافع، عن ابن عمر۔

کل کی دعوتوں میں کھڑے ہوکر کھانے کا طریقہ عام ہوتا جارہا ہے۔ اس سے بچنا چاہیے۔ اس لیے کہ یہ انسانوں کا طریقہ نہیں ہے، بلکہ جانوروں کا طریقہ ہے۔ حضرت والد ماجد رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ تو چرنے کا طریقہ ہے۔ کھانے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ کبھی ادھر سے چرلیا، کبھی ادھر سے چرلیا اور پھر اس طریقے میں بے تہذیبی ہے نا شائستگی بھی ہے اور مہمانوں کی بے عزتی ہے۔ خدا کے لیے اس طریقے کو چھوڑنے کی فکر کریں۔ ذرا سا اہتمام کی ضرورت ہے۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس طریقے میں کفایت شعاری ہے، اس لیے کہ کرسیوں کا کرایہ بچ جاتا ہے اور کم جگہ پر زیادہ کام ہوجاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ باقی سب جگہوں پر کفایت کر رکھی ہے، حالانکہ بلاوجہ چراغاں ہورہا ہے، فضول لائٹنگ ہورہی ہے، وہاں کفایت کا خیال نہیں آتا۔ اس کے علاوہ فضول رسموں میں بے پناہ رقم صرف کردی جاتی ہے، وہاں کفایت شعاری کا خیال نہیں آتا، ساری کفایت شعاری کا خیال کھڑے ہوکر کھانے میں آجاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سوائے فیشن پرستی کے اور کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ اس لیے اہتمام کر کے اس سے بچیں اور آج ہی اس بات کا عزم کرلیں کہ خواہ بٹھا کر کھلانے میں کتنا پیسہ زیادہ خرچ ہوجائے مگر کھڑے ہوکر نہیں کھلائیں گے۔ اپنے یہاں سے اس طریقے کے رواج کو ختم کریں، تاکہ یہ خبیث طریقے ہمارے یہاں سے نکل جائے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو اس سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین
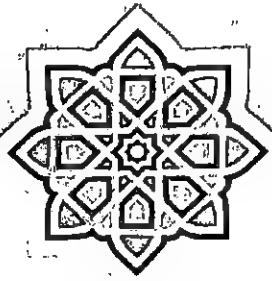
دعوت کے آداب

(اصلاحی خطبات ۵/۲۴۲)

دعوت کے آداب

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ، وَأَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَأَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ أَمَّا بَعْدُ!

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ ﷺ: ”اذا دعی احدکم فلیجب، فان کان صائما فلیصل، وان کان مفطرا فلیطعم“(۱)

(۱) صحیح مسلم ۱۰۵٤/۲ (۱٤۳۱) وسنن ابی داود ۳۳۱/۲ (۲٤٦۰) وسنن الترمذی ۱٤۱/۲ (۷۸۰).

دعوت قبول کرنا مسلمان کا حق ہے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تم میں سے کسی کی دعوت کی جائے تو اسے چاہیے کہ وہ اس کی دعوت کو قبول کرلے۔ اب اگر وہ شخص روزے سے ہے تو اس کے حق میں دعا کردے، یعنی اس کے گھر جاکر اس کے حق میں دعا کردے اور اگر روزے سے نہیں ہے تو اس کے ساتھ کھانا کھالے۔

اس حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مسلمان کی دعوت قبول کرنے کی تاکید فرمائی اور دعوت کے قبول کرنے کو مسلمانوں کے حقوق میں شمار فرمایا۔ ایک دوسری حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

"حق المسلم على المسلم خمس، رد السلام، وتشميت العاطس، واجابة الدعوة، واتباع الجنائزة، وعيادة المريض۔"(۱)

یعنی ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر پانچ حق ہیں:

پہلا: اس کے سلام کا جواب دینا۔ دوسرا: اگر کسی کو چھینک آئے تو اس کے جواب میں يرحمك الله کہنا۔ تیسرا: اگر مسلمان دعوت دے تو اس کی دعوت کو قبول کرنا۔ چوتھا: اگر کسی مسلمان کا انتقال ہوجائے تو اس کے جنازے کے پیچھے جانا۔ پانچواں: اگر کوئی مسلمان بیمار ہوجائے تو اس کی عیادت کرنا۔

---

(۱) صحیح البخاری ۷۱/۲ (۱۲۴۰) وصحیح مسلم ۱۷۰۴/۴ (۲۱۶۲)۔

حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر جو یہ پانچ حقوق بیان فرمائے ان میں سے ایک حق دعوت قبول کرنے کا بھی ہے۔ اس لیے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم میں سے کسی شخص کو دعوت دی جائے تو اس کو قبول کرنا چاہیے۔

دعوت قبول کرنے کا مقصد

اور اس نیت سے دعوت قبول کرنا چاہیے کہ یہ میرا بھائی ہے اور یہ مجھے محبت سے بلا رہا ہے۔ اس کی محبت کی قدر دانی ہوجائے اور اس کا دل خوش ہوجائے۔ دعوت قبول کرنا سنّت ہے اور باعث اجر و ثواب ہے۔ یہ نہ ہو کہ کھانا اچھا ہو تو قبول کرلے اور کھانا اچھا نہ ہو تو قبول نہ کرے، بلکہ دعوت قبول کرنے کا مقصد اور منشاء یہ ہو کہ میرے بھائی کا دل خوش ہوجائے، چنانچہ ایک حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"ولو دعیت الی کراع لأجبت"(۱)

یعنی اگر کوئی شخص بکری کے پائے کی بھی دعوت کرے گا تو میں قبول کرلوں گا۔

آج کل اگرچہ پائے کی دعوت کو عمدہ سمجھا جاتا ہے، لیکن اس زمانے میں پائے کو بہت معمولی چیز سمجھا جاتا تھا۔ لہٰذا دعوت دینے والا مسلمان غریب ہی کیوں نہ ہو تم اس کی دعوت اس نیت سے قبول کرلو کہ یہ میرا بھائی ہے، اس کا

(۱) صحیح البخاری ۳/۱۵۳ (۲۵٦۸) و ۷/۲۵ (۵۱۷۸)۔

دل خوش ہوجائے۔ غریب اور امیر کا فرق نہ ہونا چاہیے کہ اگر امیر آدمی دعوت دے رہا ہو تب تو قبول کرلی جائے اور اگر کوئی معمولی حیثیت کا غریب آدمی دعوت دے رہا ہے تو اس کو ٹال دیا، بلکہ غریب آدمی اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی دعوت قبول کی جائے۔

دال اور خشکے میں نورانیت

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کئی بار یہ واقعہ سنا کہ دیوبند میں ایک صاحب گھسیارے تھے، یعنی گھاس کاٹ کر بازار میں فروخت کرتے اور اس کے ذریعے اپنا گزر بسر کرتے تھے اور ایک ہفتے میں ان کی آمدنی چھ پیسے ہوتی تھی۔ اکیلے آدمی تھے اور اس آمدنی کو وہ اس طرح تقسیم کرتے تھے کہ اس میں سے دو پیسے اپنے کھانے وغیرہ پر خرچ کرتے تھے اور دو پیسے اللہ کی راہ میں صدقہ کیا کرتے تھے اور دو پیسے جمع کرتے تھے اور ایک دو ماہ بعد جب کچھ پیسے جمع ہوجاتے تو اس وقت دارالعلوم دیوبند کے جو بڑے بڑے بزرگ اساتذہ تھے ان کی دعوت کیا کرتے تھے اور دعوت میں خشک چاول ابال لیتے اور اس کے ساتھ دال پکالیتے اور اساتذہ کو کھلا دیتے تھے۔ میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اس وقت دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں پورے مہینے ان صاحب کی دعوت کا انتظار رہتا ہے، اس لیے کہ ان صاحب کے خشکے اور دال کی دعوت میں جو نورانیت محسوس ہوتی ہے وہ نورانیت پلاؤ اور بریانی کی بڑی بڑی دعوتوں میں محسوس نہیں ہوتی۔

دعوت کی حقیقت ''محبت کا اظہار''

لہٰذا دعوت کی حقیقت ''محبت کا اظہار'' ہے اور اس کے قبول کرنے کی بھی حقیقت ''محبت کا اظہار'' ہے۔ اگر محبت سے کسی نے تمہاری دعوت کی ہے تو محبت سے تم قبول کرلو۔ چنانچہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ کبھی کسی کی دعوت کو رد نہیں فرماتے، دعوت دینے والا چاہے معمولی آدمی کیوں نہ ہوتا۔ حتیٰ کہ بعض اوقات معمولی شخص کی دعوت پر آپ نے میلوں کا سفر کیا تو دعوت کی حقیقت یہ ہے کہ محبت سے کی جائے اور محبت سے قبول کی جائے، اخلاص سے دعوت کی جائے، اخلاص سے قبول کی جائے، تب یہ دعوت نورانیت رکھتی ہے، سنّت بھی ہے اور باعثِ اجر وثواب بھی ہے۔

دعوت یا عداوت

لیکن آج کل ہماری دعوتیں رسموں کے تابع ہو کر رہ گئی ہیں۔ رسم کے موقع پر دعوت ہوگی، اس کے علاوہ نہیں ہوگی، اب اگر دعوت قبول کرے تو مصیبت، قبول نہ کرے تو مصیبت، اسی لیے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ دعوت ہو، عداوت نہ ہو، یعنی ایسا طریقہ اختیار نہ کرو کہ وہ دعوت اس کے لیے عذاب اور مصیبت بن جائے۔ جیسا بعض لوگ کرتے ہیں، ان کے دماغ میں یہ بات آگئی کہ فلاں کی دعوت کرنی چاہیے، نہ اس بات کا خیال کیا کہ ان کے پاس وقت ہے یا نہیں؟ مگر بار بار دعوت قبول کرنے پر اصرار کر رہے ہیں، چاہے اس دعوت کی خاطر کتنی ہی مصیبت اٹھانی پڑے۔ یہ دعوت نہیں، بلکہ یہ تو اس کے ساتھ عداوت اور دشمنی ہے۔ دعوت کا پہلا تقاضہ یہ ہے کہ جس کی دعوت کر رہے

ہو، اس کو راحت پہنچانے کی فکر کرو، اس کو آرام پہنچانے کی فکر کرو، نہ یہ کہ اس پر مصیبت ڈال دو۔

اعلیٰ درجے کی دعوت

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ دعوت کی تین قسمیں ہوتی ہیں، ایک سب سے اعلیٰ، دوسرے متوسط، تیسرے ادنیٰ۔ آج کل کے ماحول میں سب سے اعلیٰ دعوت یہ ہے کہ جس کی دعوت کرنی ہو اس کو جا کر نقد ہدیہ پیش کر دو اور نقد ہدیہ پیش کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کو کوئی تکلیف تو اٹھانی نہیں پڑے گی اور پھر نقد ہدیہ میں اس کو اختیار ہوتا ہے کہ چاہے اس کو کھانے پر صرف کرے یا کسی اور ضرورت میں صرف کرے، اس سے اس شخص کو زیادہ راحت اور فائدہ ہوگا اور تکلیف اس کو ذرہ برابر بھی نہیں ہوگی، اس لیے یہ دعوت سب سے اعلیٰ ہے۔

متوسط درجے کی دعوت

دوسرے نمبر کی دعوت یہ ہے کہ جس شخص کی دعوت کرنا چاہتے ہو، کھانا پکا کر اس کے گھر بھیج دو۔ یہ دوسرے نمبر پر اس لیے ہے کہ کھانے کا قصد ہوا اور اس کو کھانے کے علاوہ کوئی اور اختیار نہیں رہا، البتہ اس کھانے پر اس کو کوئی زحمت اور تکلیف نہیں اٹھانی پڑی۔ آپ نے گھر بلانے کی زحمت اس کو نہیں دی، بلکہ گھر پر ہی کھانا پہنچا دیا۔

ادنیٰ درجے کی دعوت

تیسرے نمبر کی دعوت یہ ہے کہ اس کو اپنے گھر بلا کر کھانا کھلاؤ۔ آج کل کے شہری ماحول میں، جہاں زندگیاں مصروف ہیں، فاصلے زیادہ ہیں، اس میں اگر آپ کسی شخص کو دعوت دیں اور وہ تیس میل کے فاصلے پر رہتا ہے، تو آپ کی دعوت قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دو گھنٹے پہلے گھر سے نکلے، پچاس روپے خرچ کرے اور پھر تمہارے یہاں آ کر کھانا کھائے، تو یہ آپ نے اس کو راحت پہنچائی یا تکلیف میں ڈال دیا؟ لیکن اگر اس کے بجائے کھانا پکا کر اس کے گھر بھیج دیتے یا اس کو نقد رقم دے دیتے، اس میں اس کے ساتھ زیادہ خیر خواہی ہوتی۔

دعوت کا انوکھا واقعہ

ہمارے ایک بزرگ گزرے ہیں، حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی قدس اللہ سرہ۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے بہت گہرے دوستوں میں سے تھے، لاہور میں قیام تھا۔ ایک مرتبہ کراچی تشریف لائے تو دارالعلوم کورنگی میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ملنے کے لیے بھی تشریف لائے، چونکہ اللہ والے بزرگ تھے اور والد صاحب کے بہت مخلص دوست تھے۔ اس لیے ان کی ملاقات سے والد صاحب بہت خوش ہوئے، صبح دس بجے کے قریب دارالعلوم پہنچے تھے۔ والد صاحب نے ان سے پوچھا کہ کہاں قیام ہے؟ فرمایا کہ آگرہ کالونی میں ایک صاحب کے یہاں قیام ہے۔ کب واپس تشریف لے جائیں گے؟ فرمایا کل ان شاء اللہ واپس لاہور

روانہ ہو جاؤں گا۔ بہر حال! کچھ دیر بات چیت اور ملاقات کے بعد جب واپس جانے لگے تو والد صاحب نے ان سے فرمایا کہ بھائی مولوی ادریس! تم اتنے دنوں کے بعد یہاں آئے تو میرا دل چاہتا ہے کہ تمہاری دعوت کروں، لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تمہارا قیام آگرہ تاج کالونی میں ہے اور میں یہاں کورنگی میں رہتا ہوں۔ اب اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ فلاں وقت میرے یہاں آ کر کھانا کھائیں تب تو آپ کو میں مصیبت میں ڈال دوں گا، اس لیے کل آپ کو واپس جانا ہے۔ کام بہت سے ہوں گے اس لیے دل اس بات کو گوارہ نہیں کرتا کہ آپ کو دوبارہ یہاں آنے کی تکلیف دوں، لیکن یہ بھی مجھے گوارہ نہیں ہے کہ آپ تشریف لائیں اور بغیر دعوت کے آپ کو روانہ کردوں۔ اس لیے میری طرف سے دعوت کے بدلے یہ سو روپے ہدیہ رکھ لیں۔ مولانا ادریس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے وہ سو روپے کا نوٹ اپنے سر پر رکھ لیا اور فرمایا کہ یہ تو آپ نے مجھے بہت بڑی نعمت عطا فرمادی۔ آپ کی دعوت کا شرف بھی حاصل ہو گیا اور کوئی تکلیف بھی اٹھانی نہیں پڑی اور پھر اجازت لے کر روانہ ہو گئے۔

محبت کا تقاضا "راحت رسانی"

یہ ہے بے تکلفی اور راحت رسانی۔ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ یہ کہتا کہ یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ لاہور سے کراچی تشریف لائیں اور میرے گھر دعوت کھائے بغیر چلے جائیں، اس وقت آپ واپس جائیں اور دوسرے وقت تشریف لائیں اور کھانا کھا کر جائیں، چاہے اس کے لیے سو مصیبتیں اٹھانی پڑیں۔ اور مولانا ادریس صاحب کی جگہ کوئی اور ہوتا وہ یہ کہتا کہ میں تمہاری دعوت کا بھوکا ہوں، میں فقیر ہوں، جو تم مجھے پیسے دے رہے ہو کہ اس

کا کھانا کھالینا۔ یادرکھو۔ محبت کا پہلا تقاضہ یہ ہے کہ جس سے محبت کی جارہی ہے اس کو راحت اور آرام پہنچانے کی کوشش کی جائے نہ یہ کہ اس کو تکلیف میں ڈالا جائے۔ میرے بڑے بھائی ذکی کیفی مرحوم اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔ شعر بہت اچھے کہا کرتے تھے، ان کا ایک بہت خوبصورت شعر ہے کہ ؎

میرے محبوب مری ایسی وفا سے توبہ
جو ترے دل کی کدورت کا سبب بن جائے

ایسی وفاداری اور ایسا اظہار محبت جس سے تکلیف ہو، جس سے دل میں کدورت پیدا ہو جائے، میں ایسی وفاداری اور محبت سے توبہ کرتا ہوں۔ جب بھائی صاحب نے یہ شعر کہا تو میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ کے اس شعر نے بدعت کی جڑ کاٹ دی، اس لیے ساری بدعات اسی سے پیدا ہوتی ہیں کہ آدمی اپنی طرف سے وفاداری کے طریقے گھڑ کر اس پر عمل شروع کر دیتا ہے اور اس کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ وفاداری کا یہ طریقہ میرے محبوب کے دل کی کدورت کا سبب بن رہا ہے۔

دعوت کرنا ایک فن ہے

بہر حال! دعوت کرنا بھی ایک فن ہے، ایسی دعوت کرو جس سے واقعی راحت پہنچے، جس سے آرام ملے، نہ یہ کہ دوسرے کے لیے تکلیف کا سبب بن جائے۔ دوسرے یہ کہ دعوت کا منشا تو محبت کا اظہار ہے، محبت کے تقاضے پر عمل کرنا ہے۔ اس دعوت کا رسموں سے کوئی تعلق نہیں۔ مثلاً یہ رسم ہے کہ عقیقے کے

موقع پر دعوت کی جاتی ہے یا تیجے دسویں اور چالیسویں کے موقع پر دعوت کی جاتی ہے اس رسم کے موقع پر دعوت کریں گے فلاں کو بلائیں گے یاد رکھیے، ان رسمی دعوتوں کا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت سے کوئی تعلق نہیں، دعوت تو وہ ہے جو کھلے دل سے کسی قید اور شرط کے بغیر کسی رسم کے بغیر آدمی دوسرے کی دعوت کرے۔

یہ باتیں تو دعوت کرنے کے بارے میں تھیں، جہاں تک دعوت قبول کرنے کا تعلق ہے اس کے بارے میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے کہ اس کی دعوت کو قبول کرے، لیکن دعوت قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دعوت قبول کرنے والے کے پیش نظر اس کی محبت اور قدردانی ہو اور اس کے پیشِ نظر یہ نہ ہو کہ اگر میں اس دعوت میں شریک نہیں ہوا تو خاندان میں میری ناک کٹ جائے گی، اگر اس خیال کے ساتھ شریک ہوا تو پھر وہ دعوت قبول کرنا مسنون نہیں رہے گا، یہ دعوت مسنون اس وقت ہوگی جب شرکت سے پیش نظر یہ ہو کہ میرے جانے سے اس کا دل خوش ہوجائے گا۔

دعوت قبول کرنے کی شرط

پھر دعوت قبول کرنے کی ایک شرط ہے، وہ یہ کہ دعوت قبول کرنا اس وقت سنّت ہے جب اس دعوت کو قبول کرنے کے نتیجے میں آدمی کسی مصیبت اور گناہ میں مبتلا نہ ہو۔ مثلاً ایک ایسی جگہ کی دعوت قبول کرلی جہاں گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہورہا ہے، اب ایک سنّت پر عمل کرنے کے لیے گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کیا جارہا

ہے، ایسی دعوت قبول کرنا سنّت نہیں۔ آج کل اکثر دعوتیں ایسی ہیں جن میں یہ مصیبت پائی جاتی ہے، ان میں معصیتیں ہورہی ہیں، منکرات ہورہے ہیں، گناہوں کا ارتکاب ہورہا ہے۔ شادی کے کارڈ پر لکھا ہوتا ہے ''ولیمہ مسنونہ'' یہ تو معلوم ہے کہ ولیمہ کرنا سنّت ہے، لیکن کس طرح یہ ولیمہ مسنونہ کیا جائے؟ اس کا کیا طریقہ ہے؟ یہ معلوم نہیں۔ چنانچہ ولیمہ مسنونہ کے اندر بے پردگی ہورہی ہے، مردوں اور عورتوں کا مخلوط اجتماع ہے، گناہوں کا ارتکاب ہورہا ہے۔

کب تک ہتھیار ڈالو گے؟

یہ سب کیوں ہورہا ہے؟ اس لیے کہ ہم لوگ ان رسموں اور گناہوں کے سامنے ہتھیار ڈالتے ڈالتے اب اس مقام تک پہنچ گئے کہ مفاسد، گناہ، منکرات معاشرے میں پھیل کر رائج ہوگئے ہیں۔ اگر کسی وقت کوئی اللہ کا بندہ اسٹینڈ لے کر خاندان والوں سے یہ کہتا ہے کہ اگر اس گناہ کا ارتکاب ہوگا تو میں اس دعوت میں شریک نہیں ہوں گا، تو اس بات کی امید تھی کہ اتنی تیزی سے منکرات نہ پھیلتے۔ آج جب لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ جس دعوت میں مردوں اور عورتوں کا مخلوط اجتماع ہو، اس میں شرکت مت کرو تو لوگ یہ جواب دیتے ہیں کہ ''اگر ہم نے شرکت نہ کی تو خاندان سے اور معاشرے سے کٹ جائیں گے۔'' میں کہتا ہوں کہ ''اگر گناہوں سے بچنے کے لیے اللہ کی خاطر خاندان سے کٹنا پڑے تو کٹ جاؤ، یہ کٹنا تمہارے لیے مبارک ہے اور اگر کوئی تمہاری دعوت کرنا چاہتا ہے تو اس کو چاہیے کہ وہ تمہارے اصول کا بھی کچھ خیال کرے، جو شخص تمہارے اصول کا خیال نہیں رکھتا اس کی دعوت قبول کرنا تمہارے ذمے کوئی ضروری نہیں۔''

اگر ایک مرتبہ کچھ لوگ اسٹینڈ لے لیں اور اپنے خاندان والوں سے صاف صاف کہہ دیں کہ ہم مردوں اور عورتوں کی مخلوط دعوتوں میں شریک نہیں ہوں گے۔ اگر ہمیں بلانا چاہتے ہو تو مردوں اور عورتوں کا انتظام الگ کرو، پھر دیکھو گے کہ کچھ عرصے کے اندر اس کی بہت اصلاح ہوسکتی ہے۔ ابھی یہ سیلاب اتنا آگے نہیں بڑھا، لیکن اصل بات یہ ہے کہ جو آدمی دین پر عمل کرنا چاہتا ہے وہ یہ بات کہتے ہوئے شرماتا ہے، وہ اس سے ڈرتا ہے کہ اگر میں نے یہ بات کہی تو لوگ مجھے بیک ورڈ (Back Word) سمجھیں گے، پسماندہ اور رجعت پسند سمجھیں گے اور اس کے برخلاف جو شخص بے دینی اور آزادی کے راستے پر چلتا ہے وہ سینہ تان کر فخر کے ساتھ اپنی آزادی اور بے دینی کی طرف دعوت دیتا ہے۔

اب تو شادی اور دیگر تقریبات کی دعوتوں میں یہاں تک نوبت آگئی ہے کہ نوجوان لڑکیاں مردوں کے سامنے رقص کرنے لگی ہیں، مگر پھر بھی ایسی دعوتوں میں لوگ شریک ہو رہے ہیں۔ کہاں تک اس سیلاب میں بہتے جاؤ گے؟ کہاں تک خاندان والوں کا ساتھ دو گے؟ اگر یہی سلسلہ چلتا رہا تو کوئی بعید نہیں کہ مغربی تہذیب کی لعنتیں ہمارے معاشرے پر بھی پوری طرح مسلط ہوجائیں، کوئی حد تو ہوگی جہاں جا کر تمہیں رکنا پڑے گا۔ اس لیے اپنے لیے کچھ ایسے اصول بنالو۔ مثلاً جس دعوت میں کھلے منکرات کا ارتکاب ہوگا وہاں ہم شریک نہیں ہوں گے یا جس دعوت میں مخلوط اجتماع ہوگا ہم شریک نہیں ہوں گے اگر اب بھی اللہ کے کچھ بندے اسٹینڈ لے لیں تو اس سیلاب پر بند لگ سکتا ہے۔

پردہ دار خاتون اچھوت بن جائے؟

بعض اوقات لوگ یہ سوچتے ہیں کہ تقریبات میں پردہ کرنے والی عورتیں

اکا دکا ہی ہوتی ہیں تو ان کے لیے ہم علیحدہ انتظام کردیں گے۔ ذرا سوچو، کیا تم اس پردہ دار خاتون کو اچھوت بنانا چاہتے ہو؟ وہ سب سے الگ اچھوت بن کر بیٹھی رہے، اگر ایک بے پردہ عورت ہے، وہ اگر مردوں سے الگ پردہ میں ہوجائے تو اس کا کیا نقصان ہوا؟ لیکن ایک پردہ دار بے پردہ ہوکر مردوں کے سامنے چلی جائے گی تو اس کا تو دین غارت ہوجائے گا اس لیے مردوں اور عورتوں کے الگ انتظام کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہے، بس صرف توجہ دینے کی بات ہے، صرف اہتمام کرنے اور اس پر ڈٹ جانے کی بات ہے۔

دعوت قبول کرنے کا شرعی حکم

اور شرعی مسئلہ یہ ہے کہ جس دعوت کے بارے میں پہلے سے یہ معلوم ہو کہ اس دعوت میں فلاں گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہوگا اور اندیشہ یہ ہو کہ میں بھی اس گناہ میں مبتلا ہوجاؤں گا، اس دعوت میں شرکت کرنا جائز نہیں اور جس دعوت کے بارے میں یہ خیال ہو کہ اس دعوت میں فلاں گناہ ہوگا، لیکن میں اپنے آپ کو اس گناہ سے بچالوں گا، ایسی دعوت میں عام آدمی کو شرکت کی گنجائش ہے، لیکن جس آدمی کی طرف لوگوں کی نگاہیں ہوتی ہیں اور جن کی لوگ اقتداء کرتے ہیں ایسے آدمی کے لیے کسی حال میں ایسی دعوت میں شرکت کرنا جائز نہیں اور یہ دعوت قبول کرنے کا اہم اصول ہے۔ دعوت قبول کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی اس کی وجہ سے گناہوں کا ارتکاب کرے۔

دعوت کے لیے نفلی روزہ توڑنا

اس حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمادیا کہ جس شخص کی

دعوت کی گئی ہے اگر وہ روزہ دار ہے اور روزے کی وجہ سے کھانا نہیں کھا سکتا تو وہ میزبان کے حق میں دعا کردے۔ فقہاءِ کرام نے تو بعض احادیث (۱) کی روشنی میں یہاں تک لکھا ہے کہ اگر نفلی روزہ کسی نے رکھا ہے اور اس کی کسی مسلمان نے دعوت کردی تو اب مسلمان کی دعوت قبول کرنے کے لیے اور اس کا دل خوش کرنے کے لیے نفلی روزہ توڑ دے تو اس کی بھی اجازت ہے بعد میں اس روزے کی قضا کرلے، لیکن اگر روزہ توڑنا نہیں چاہتا تو کم از کم اس کے حق میں دعا کرے۔

بن بلائے مہمان کا حکم

”عن ابی مسعود البدری رضی اللہ عنہ قال: دعا رجل النبی ﷺ لطعام صنعه له خامس خمسة، فتبعهم رجل، فلمّا بلغ الباب قال النبی ﷺ ان هذا قد تبعنا، فان شئت ان تاذن وان شئت رجع، قال: بل آذن له یارسول الله“(۲)

حضرت ابو مسعود البدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی اور آپ کے ساتھ چار افراد کی بھی دعوت کی۔ سادگی کا زمانہ تھا اس لیے بسا اوقات جب کوئی شخص حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی

(۱) ملاحظہ ہو مسند الطيالسی٣/٦٥٥ (٢٣١٧) والسنن الكبرى للبيهقی ٤/٤٦٢ (٨٣٦٢) وأورده الحافظ في ”الفتح“٤/٢١٠معزوًّا للبيهقي، وقال: وإسناده حسن.
(۲) صحيح البخاری٣/٥٨(٢٠٨١) و٣/١٣١(٢٤٥٦) وصحيح مسلم٣/١٦٠٨(٢٠٣٦).

دعوت کرتا تو عام طور پر وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی کہہ دیتا کہ آپ اپنے ساتھ مزید تین افراد کو بھی لے آئیں یا چار افراد کو لے آئیں، چنانچہ ان صاحب نے پانچ افراد کی دعوت کی تھی۔ ایک حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور چار صحابہ کرام، جب حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم دعوت میں جانے لگے تو ایک صاحب اور ساتھ ہو لیے جیسے بزرگوں کے بعض معتقدین ہوتے ہیں کہ جو بزرگوں کے ساتھ لگ جاتے ہیں۔ جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میزبان کے گھر کے دروازے پر پہنچے تو آپ نے میزبان سے فرمایا کہ یہ صاحب ہمارے ساتھ آ گئے ہیں، ان کو آپ نے دعوت نہیں دی تھی، اب اگر آپ کی اجازت ہو تو یہ اندر آ جائیں اگر اجازت نہ ہو تو یہ واپس چلے جائیں۔ میزبان نے کہا: یا رسول اللہ! میں اجازت دیتا ہوں آپ ان کو بھی اندر لے آئیں۔

وہ شخص چور اور لیٹرا ہے

اس حدیث کے ذریعے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم دی کہ جب کسی کے گھر دعوت میں شرکت کے لیے جاؤ اور اتفاق سے کوئی ایسا شخص تمہارے ساتھ اس دعوت پر آ گیا جس کو دعوت نہیں دی گئی تو میزبان کو اس کے آنے کی اطلاع کر دو اور پھر اس کی اجازت کے بعد اس کو دعوت میں شریک کرو، کیونکہ ایک حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی دعوت میں بن بلائے شرکت کر لے تو وہ شخص چور بن کر داخل ہوا اور لٹیرا بن کر نکلا[1]۔

(۱) سنن ابی داود ۳۴۱/۳ (۳۷۴۱) قال ابو داود: ابان بن طارق مجهول، وقال المنذري في "مختصره" ۴۳۹/۳ (۳۵۹۴): في إسناده أبان بن طارق البصري، سئل عنه أبوزرعة =

میزبان کے بھی حقوق ہیں

درحقیقت حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تعلیم ایک بہت بڑے اصول کی نشان دہی کرتی ہے جس کو ہم نے بھلا دیا ہے، وہ یہ کہ ہمارے ذہنوں میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کا مہمان بن جائے تو میزبان پر بے شمار حقوق عائد ہوجاتے ہیں کہ وہ اس کا اکرام کرے، اس کی خاطر مدارات کرے وغیرہ، لیکن اس حدیث کے ذریعے سے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتادیا کہ جس طرح مہمان کے حقوق میزبان پر ہیں اسی طرح میزبان کے بھی کچھ حقوق مہمان پر ہیں۔ ان میں سے ایک حق یہ ہے کہ وہ مہمان میزبان کو بلا وجہ تکلیف نہ دے، مثلاً یہ کہ مہمان ایسے لوگوں کو اپنے ساتھ نہ لے جائے جن کی دعوت نہیں ہے، جیسے آج کل کے بعض پیروں، فقیروں کے یہاں ہوتا ہے جب کسی نے پیر صاحب کی دعوت کی تو اب پیر صاحب اکیلے نہیں جائیں گے، بلکہ ان کے ساتھ ایک لشکر بھی میزبان کے گھر پر حملہ آور ہوجائے گا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس میزبان کو پتہ بھی نہیں ہوتا کہ اتنے مہمان آئیں گے جب اچانک وقت پر اتنا بڑا لشکر پہنچ جاتا ہے تو اب میزبان کے لیے ایک مصیبت کھڑی ہوجاتی ہے۔

اسی لیے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسا شخص چور بن کر داخل ہوا اور لیٹرا بن کر نکلا۔ البتہ جہاں بے تکلفی کا معاملہ ہو اور یقین سے یہ بات معلوم ہو کہ اگر میں اس کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا تو میزبان اور زیادہ خوش ہوجائے گا،

= الرازي، فقال: شيخ مجهول، وقال أبو أحمد بن عدي: وأبان بن طارق لا يعرف إلا بهذا الحديث، وهذا الحديث معروف به، وليس له أنكر من هذا الحديث، وفي إسناده أيضاً درست بن زياد، ولا يحتج بحديثه، ويقال: هو درست بن حمزة، وقيل بل هما اثنان ضعيفان. وشعب الإيمان للبيهقي ۱۵۲/۱۲ (۹۲۰۰-۹۲۰۱).

ایسے مواقع پر ساتھ لے جانے میں کوئی مضائقہ نہیں، البتہ جہاں ذرا بھی تکلیف پہنچنے کا احتمال ہو وہاں پہلے سے بتانا واجب ہے۔

پہلے سے اطلاع کرنی چاہیے

اسی طرح میزبان کا ایک حق یہ ہے کہ جب تم کسی کے یہاں مہمان بن کر جانا چاہتے ہو تو پہلے سے اس کو اطلاع کردو یا کم از کم ایسے وقت میں جاؤ کہ وہ کھانے کا انتظام آسانی کے ساتھ کر سکے، کیونکہ اگر تم عین کھانے کے وقت کسی کے گھر پہنچ گئے تو اس کو فوری طور پر کھانے کا انتظام کرنے میں تکلیف اور مشقت ہوگی، لہٰذا ایسے وقت میں جانا ٹھیک نہیں یہ میزبان کا حق ہے۔

مہمان بلا اجازت روزہ نہ رکھے

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر قربان جایئے کہ ایک حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ کسی مہمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ میزبان کو بتائے بغیر روزہ رکھے(۱)، اس لیے کہ جب تم نے اس کو بتایا نہیں کہ آج میں روزہ رکھوں گا اس کو تو یہ معلوم ہے کہ تم اس کے مہمان ہو، اس لیے وہ تمہارے لیے ناشتے کا بھی

---

(۱) سنن الترمذی ۱۴۷/۲ (۷۸۹) وقال: هذا حديث منكر، لا نعرف أحدًا من الثقات روى هذا الحديث، عن هشام بن عروة، وقد روى موسى بن داود، عن أبي بكر المدني، عن هشام بن عروة، عن أبيه، عن عائشة، عن النبيﷺ، نحوًا من هذا. وهذا حديث ضعيف أيضا، وأبو بكر ضعيف عند أهل الحديث، وأبو بكر المدني الذي روى عن جابر بن عبد الله اسمه الفضل بن مبشر، وهو أوثق من هذا وأقدم۔ وسنن ابن ماجه ۲۳۷/۳ (۱۷۶۳)۔

انتظام کرے گا۔ دوپہر کے کھانے کا بھی انتظام کرے گا، اب جب اس نے سب انتظام کرلیا تو عین وقت پر تم نے اس سے کہا کہ میرا تو روزہ ہے، اس کی محنت بے کار گئی اس کے مصارف بے کار گئے اور اس کو تم نے تکلیف بھی پہنچائی اس لیے حکم یہ ہے کہ میزبان کی اجازت کے بغیر روزہ رکھنا جائز نہیں، لہٰذا جس طرح مہمان کے حقوق ہیں اسی طرح میزبان کے بھی حقوق ہیں۔

مہمان کو کھانے کے وقت پر حاضر رہنا چاہیے

یا مثلاً میزبان کے یہاں کھانے کا وقت مقرر ہے اور تم اس وقت غائب ہو گئے اور وہ تم کو تلاش کرتا پھر رہا ہے اور اب وہ بے چارہ مہمان کے بغیر کھانا نہیں کھاسکتا۔ اس لیے اصول یہ ہے کہ مہمان کو چاہیے کہ اگر کسی وقت کھانا نہ کھانا ہو یا دیر ہوجانے کا امکان ہو تو پہلے سے میزبان کو بتا دو کہ آج میں کھانے پر دیر سے آؤں گا۔ تاکہ اس کو تلاش اور انتظام کی تکلیف نہ ہو۔

میزبان کو تکلیف دینا گناہِ کبیرہ ہے

دین صرف نماز روزے کا اور ذکر و تسبیح کا نام نہیں یہ سب باتیں دین کا حصہ ہیں۔ ہم نے اس کو دین سے خارج کردیا ہے بڑے بڑے دین دار، بڑے بڑے تہجد گزار، اشراق اور چاشت پڑھنے والے بھی معاشرت کے ان آداب کا لحاظ نہیں کرتے، جس کی وجہ سے گناہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یاد رکھو! اگر ان آداب کا لحاظ نہ کرنے کے نتیجے میں میزبان کو تکلیف ہوگی تو ایک مسلمان کو تکلیف پہنچانے کا گناہ کبیرہ اس مہمان کو ہوگا۔

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ کسی مسلمان کو اپنے قول یا فعل سے تکلیف پہنچانا ایسے ہی گناہ کبیرہ ہے جیسے شراب پینا، چوری کرنا، زنا کرنا گناہ کبیرہ ہے، لہٰذا اگر تم نے اپنے کسی عمل سے میزبان کو تکلیف میں مبتلا کردیا تو یہ ایذاء مسلم ہوئی یہ سب گناہ کبیرہ ہے۔ یہ ساری باتیں اس اصول میں داخل ہیں جو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بتادیا۔ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان احکام پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔
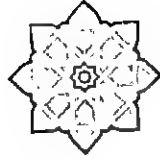
سلام کرنے کے آداب

(اصلاحی خطبات ۶/۱۸۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سلام کرنے کے آداب

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ أَمَّا بَعْدُ!

”عن البراء بن عازب رضی اللہ عنہ قال: أمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِسَبْعٍ: عِيَادَةِ الْمَرِيْضِ وَاتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ، وَتَشْمِيْتِ الْعَاطِسِ، وَنَصْرِ الضَّعِيْفِ، وَعَوْنِ الْمَظْلُوْمِ، وَإِفْشَاءِ السَّلَامِ، وَإِبْرَارِ الْمُقْسِمِ“(۱)

(۱) صحيح البخاری ۱۲۹/۳ (۲۴۴۵) و ۲۴/۷ (۵۱۷۵) و صحيح مسلم ۱۶۳۵/۳ (۲۰۶۶)۔

سات باتوں کا حکم

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سات باتوں کا حکم دیا: (۱) مریض کی عیادت کرنا (۲) جنازوں کے پیچھے چلنا (۳) چھینکنے والے کے الحمد للہ کہنے کے جواب میں یرحمک اللہ کہنا (۴) کمزور آدمی کی مدد کرنا (۵) مظلوم کی امداد کرنا، (۶) سلام کو رواج دینا، (۷) قسم کھانے والے کی قسم کو پورا کرنے میں تعاون کرنا۔

ان سات میں سے الحمد للہ پانچ چیزوں کا بیان ہو چکا، چھٹی چیز ہے سلام کو رواج دینا اور آپس میں ایک دوسرے سے ملاقات کے وقت سلام کرنا۔ سلام کا طریقہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے ایسا مقرر فرمایا ہے جو ساری دوسری قوموں سے بالکل ممتاز ہے۔ ہر قوم کا یہ دستور ہے کہ جب وہ آپس میں ملاقات کرتے ہیں تو کوئی نہ کوئی لفظ ضرور استعمال کرتے ہیں، کوئی ''ہیلو'' کہتا ہے، کوئی ''گڈ مارننگ'' کہتا ہے، کوئی ''گڈ ایوننگ'' کہتا ہے، کوئی ''نمستے'' کہتا ہے، کوئی ''نمسکار'' کہتا ہے۔ گویا کہ ہر قوم والے کوئی نہ کوئی لفظ استعمال کرتے ہیں، لیکن اللہ جل جلالہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے جو لفظ تجویز فرمایا ہے وہ تمام الفاظ سے نمایاں اور ممتاز ہے وہ ہے ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ''۔

سلام کرنے کا فائدہ

دیکھیے: اگر آپ نے کسی سے ملاقات کے وقت ''ہیلو'' کہہ دیا تو آپ کے اس لفظ سے اس کو کیا فائدہ ہوا؟ دنیا کا کوئی فائدہ ہوا؟ یا آخرت کا کوئی فائدہ ہوا؟ ظاہر ہے کہ کوئی فائدہ نہیں ہوا، لیکن اگر آپ نے ملاقات کے وقت یہ الفاظ

کہے: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''تم پر سلامتی ہو اور اللہ کی رحمتیں اور برکتیں ہوں'' تو ان الفاظ سے یہ فائدہ ہوا کہ آپ نے ملاقات کرنے والے کو تین دعائیں دے دیں اور اگر آپ نے کسی کو ''Good Morning'' یا ''Good Evening'' کہا، یعنی صبح بخیر، شام بخیر، تو اگر اس کو دعا کے معنی پر بھی محمول کرلیں تو اس صورت میں آپ نے جو اس کو دعا دی، وہ صرف صبح اور شام کی حد تک محدود ہے کہ تمہاری صبح اچھی ہوجائے یا تمہاری شام اچھی ہوجائے، لیکن اسلام نے ہمیں جو کلمہ سکھایا۔ وہ ایسا جامع کلمہ ہے کہ اگر ایک مرتبہ بھی کسی مخلص مسلمان کا سلام اور دعا ہمارے حق میں اللہ کی بارگاہ میں قبول ہوجائے تو ان شاء اللہ ساری گندگی ہم سے دور ہوجائے گی اور دنیا و آخرت کی فلاح حاصل ہوجائے گی۔ یہ نعمت آپ کو دنیا کی دوسری قوموں میں نہیں ملے گی۔

سلام اللہ کا عطیہ ہے

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ جاؤ اور فرشتوں کی جو جماعت بیٹھی ہے اس کو سلام کرو اور وہ فرشتے جو جواب دیں اس کو سننا، اس لیے کہ وہ تمہارا اور تمہاری اولاد کا سلام ہوگا، چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام نے جا کر سلام کیا، ''السلام علیکم'' تو فرشتوں نے جواب میں کہا: ''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ'' چنانچہ فرشتوں نے لفظ ''رحمۃ اللہ'' بڑھا کر جواب دیا(۱)۔ یہ نعمت اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس طرح عطا فرمائی۔ اگر ذرا غور کریں تو یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ اس کا حد و حساب ہی نہیں۔

---

(۱) صحیح البخاری ۸/۵۰ (۶۲۲۷)۔

اب اس سے زیادہ ہماری بدنصیبی کیا ہوگی کہ اس اعلیٰ ترین کلمے کو چھوڑ کر ہم اپنے بچوں کو ''گڈ مارننگ'' اور ''گڈ ایوننگ'' سکھائیں اور دوسری قوموں کی نقالی کریں۔ اس سے زیادہ ناقدری، ناشکری اور محرومی اور کیا ہوگی۔

سلام کرنے کا اجر و ثواب

افضل طریقہ یہ ہے کہ ملاقات کے وقت پورا سلام کیا جائے، یعنی ''السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ'' صرف ''السلام علیکم'' کہہ دیا تب بھی سلام ہوجائے گا، لیکن تین جملے بولنے میں زیادہ اجر و ثواب ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مجلس میں تشریف فرما تھے، ایک صحابی تشریف لائے اور کہا: ''السلام علیکم'' آپ نے ان کے سلام کا جواب دیا اور فرمایا: ''دس'' اِس کے بعد دوسرے صحابی آئے اور آ کر سلام کیا۔ ''السلام علیکم و رحمۃ اللہ'' آپ نے ان کے سلام کا جواب دیا اور فرمایا ''بیس'' اس کے بعد تیسرے صحابی آئے اور آ کر سلام کیا ''السلام علیکم و رحمۃ اللہ وبرکاتہ'' آپ نے ان کے سلام کا جواب دیا اور فرمایا ''تیس''۔ آپ کا مطلب یہ تھا کہ ''السلام علیکم'' کہنے میں انسان کو دس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے اور ''السلام علیکم و رحمۃ اللہ'' کہنے میں بیس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے اور ''السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ'' کہنے میں تیس نیکیوں کا ثواب ملتا ہے، اگرچہ سلام کی سنّت صرف ''السلام علیکم'' کہنے سے ادا ہوجاتی ہے۔ دیکھیے: ان الفاظ میں دعا بھی ہے اور اجر و ثواب الگ ہے۔ (۱)

(۱) سنن ابی داود ٤/٣٥٠ (٥١٩٥) وسنن الترمذی ٤/٤٢٠ (٢٦٨٩) وقال هذا حديث حسن صحيح۔

اور جب سلام کیا جائے تو صاف الفاظ میں سلام کرنا چاہیے، الفاظ بگاڑ کر مسخ کر کے سلام نہیں کرنا چاہیے، بعض لوگ اس طرح سلام کرتے ہیں کہ جس کی وجہ سے پوری طرح سمجھ نہیں آتا کہ کیا الفاظ کہے؟ اس لیے پوری طرح واضح کر کے ''السلام علیکم'' کہنا چاہیے۔

سلام کے وقت یہ نیت کرلیں

ایک بات میں اور غور کیجیے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ہمیں جو کلمہ تلقین فرمایا وہ ہے ''السلام علیکم'' جو جمع کا صیغہ ہے۔ ''السلام علیک'' نہیں فرمایا۔ اس لیے کہ ''السلام علیک'' کے معنی ہیں: ''تجھ پر سلامتی ہو'' اور السلام علیکم کے معنی ہیں کہ ''تم پر سلامتی ہو۔'' اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ جس طرح ہم لوگ اپنی گفتگو میں ''تو'' کے بجائے ''تم'' یا ''آپ'' کے لفظ سے خطاب کرتے ہیں جس کے ذریعے مخاطب کی تعظیم مقصود ہوتی ہے، اسی طرح ''السلام علیکم'' میں جمع کا لفظ مخاطب کی تعظیم کے لیے لایا گیا ہے۔

لیکن بعض علماء نے اس کی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ اس لفظ سے ایک تو مخاطب کی تعظیم مقصود ہے۔ دوسرے یہ کہ جب تم کسی کو سلام کرو تو سلام کرتے وقت یہ نیت کرو کہ میں تین افراد پر سلام کرتا ہوں۔ ایک اس شخص کو اور دو اُن فرشتوں کو سلام کرتا ہوں جو اس کے ساتھ ہر وقت رہتے ہیں۔ جن کو ''کراما کاتبین'' کہا گیا ہے۔ ایک فرشتہ انسان کی نیکیاں لکھتا ہے، دوسرا فرشتہ اس کی برائیاں لکھتا ہے، اس لیے سلام کرتے وقت ان کی بھی نیت کرلو، تاکہ تمہارا سلام تین افراد کو ہوجائے اور اب ان شاء اللہ تین افراد کو سلام کرنے کا ثواب مل جائے گا اور جب تم فرشتوں کو سلام کرو گے تو وہ تمہارے سلام کا ضرور جواب بھی

دیں گے اور اس طرح ان فرشتوں کی دعائیں تمہیں حاصل ہوجائیں گی جو اللہ تعالیٰ کی معصوم مخلوق ہیں۔

نماز میں سلام پھیرتے وقت کی نیت

اسی وجہ سے بزرگوں نے فرمایا کہ نماز کے اندر جب آدمی سلام پھیرے تو داہنی طرف سلام پھیرتے وقت یہ نیت کرلے کہ میرے دائیں جانب جتنے مسلمان اور جتنے فرشتے ہیں ان سب پر سلامتی بھیج رہا ہوں اور جب بائیں جانب سلام پھیرے تو اس وقت یہ نیت کرلے کہ میرے بائیں جانب جتنے مسلمان اور فرشتے ہیں ان سب پر سلامتی بھیج رہا ہوں اور پھر یہ ممکن نہیں ہے کہ تم فرشتوں کو سلام کرو اور وہ جواب نہ دیں۔ وہ ضرور جواب دیں گے اور اس طرح ان کی دعائیں تمہیں حاصل ہوجائیں گی، لیکن ہم لوگ بے خیالی میں سلام پھیر دیتے ہیں اور نیت نہیں کرتے، جس کی وجہ سے اس عظیم فائدے اور ثواب سے محروم رہ جاتے ہیں۔

جواب سلام سے بڑھ کر ہونا چاہیے

سلام کی ابتداء کرنا بڑا اجر وثواب کا موجب ہے اور سنت ہے اور سلام کا جواب دینا واجب ہے، قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا[1]

فرمایا کہ جب تمہیں سلام کیا جائے تو تم اس کے سلام سے بڑھ کر جواب

---

(۱) سورۃ النساء آیت (۸۶)۔

دو، کم از کم ویسا جواب دو جیسا اس نے سلام کیا۔ مثلاً کسی نے ''السلام علیکم'' کہا تو تم جواب میں ''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ و برکاتہ'' کہو، تا کہ جواب سلام سے بڑھ کر ہوجائے ورنہ کم از کم ''وعلیکم السلام'' ہی کہہ دو تا کہ جواب برابر ہوجائے۔

مجلس میں ایک مرتبہ سلام کرنا

اگر مجلس میں بہت سے لوگ بیٹھے ہیں اور ایک شخص اس مجلس میں آئے، تو وہ آنے والا شخص ایک مرتبہ سب کو سلام کرلے تو یہ کافی ہے اور مجلس میں سے ایک شخص اس کے سلام کا جواب دے دے تو سب کی طرف سے واجب ادا ہوجاتا ہے، ہر ایک کو علیحدہ جواب دینے کی ضرورت نہیں۔

اِن مواقع پر سلام کرنا جائز نہیں

سلام کرنا بہت سی جگہ پر ناجائز بھی ہوتا ہے۔ مثلاً جب کوئی شخص دوسرے لوگوں سے کوئی دین کی بات کررہا ہو اور دوسرے لوگ سن رہے ہوں تو اس وقت آنے والے کو سلام کرنا جائز نہیں، بلکہ سلام کیے بغیر مجلس میں بیٹھ جانا چاہیے اسی طرح اگر ایک شخص تلاوت کررہا ہے اس کو بھی سلام کرنا جائز نہیں۔ اسی طرح ذکر کرنے والے کو سلام کرنا جائز نہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب کوئی آدمی کسی کام میں مشغول ہو اور اس بات کا اندیشہ ہو کہ تمہارے سلام کا جواب دینے سے اس کے کام میں حرج ہوگا ایسی صورت میں سلام کرنے کو پسند نہیں کیا گیا۔ اس لیے ایسے موقع پر سلام نہیں کرنا چاہیے۔[1]

---

(۱) ملاحظہ ہو الدر المختار مع رد المحتار ۱/۶۱۷-۶۱۸۔ طبع دار الفکر۔

دوسرے کے ذریعے سلام بھیجنا

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کا سلام پہنچاتا ہے کہ فلاں شخص نے آپ کو سلام کہا ہے اور دوسرے شخص کے ذریعے سلام بھیجنا بھی سنّت ہے اور یہ بھی سلام کے قائم مقام ہے اور اس کے ذریعے بھی سلام کی فضیلت حاصل ہوجاتی ہے، لہٰذا جب کسی کو دوسرے کا سلام پہنچایا جائے تو اس کے جواب کا مسنون طریقہ یہ ہے ''عَلَیْھِمْ وَعَلَیْکُمُ السَّلَام'' اس کا مطلب یہ ہے کہ ان پر بھی سلامتی ہو، جنہوں نے سلام بھیجا اور تم پر بھی سلامتی ہو اس میں دو سلام اور دعائیں جمع ہوگئیں اور دو آدمیوں کو دعا دینے کا ثواب مل گیا۔

بعض لوگ اس موقع پر بھی ''وعلیکم السلام'' سے جواب دیتے ہیں اس سے جواب تو ادا ہوجائے گا، لیکن صحیح جواب نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اس صورت میں آپ نے اس شخص کو تو سلامتی کی دعا دے دی جو سلام لانے والا ہے اور وہ شخص جو اصل سلام بھیجنے والا تھا۔ اس کو دعا نہیں دی، اس لیے جواب دینے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ''علیھم وعلیکم السلام'' کہہ کر جواب دیا جائے۔

تحریری سلام کا جواب واجب ہے

اگر کسی کے پاس کسی شخص کا خط آئے اور اس خط میں ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ'' لکھا ہو تو اس کے بارے میں بعض علماء نے فرمایا کہ اس سلام کا تحریری جواب دینا چونکہ واجب ہے اس لیے خط کا جواب دینا بھی واجب ہے۔ اگر خط کے ذریعے اس کے سلام کا جواب اور اس کے خط کا جواب نہیں دیں گے تو ایسا ہوگا کہ جیسے کوئی شخص آپ کو سلام کرے اور آپ جواب نہ دیں، لیکن بعض

دوسرے علماء نے فرمایا کہ اس خط کا جواب دینا واجب نہیں ہے۔ اس لیے کہ خط کا جواب دینے میں پیسے خرچ ہوتے ہیں اور کسی انسان کے حالات بعض اوقات اس کے متحمل نہیں ہوتے کہ وہ پیسے خرچ کرے، اس لیے اس خط کا جواب دینا واجب تو نہیں، لیکن مستحب ضرور ہے، البتہ جس وقت خط کے اندر سلام کے الفاظ پڑھے، اس وقت زبان سے اس سلام کا جواب دینا واجب ہے اور اگر خط پڑھتے وقت بھی زبان سے سلام کا جواب نہ دیا اور نہ خط کا جواب دیا تو اس صورت میں ترکِ واجب کا گناہ ہوگا۔ اس میں ہم سے کتنی کوتاہی ہوتی ہے کہ خط آتے ہیں اور پڑھ کر اس کو ویسے ہی ڈال دیتے ہیں، نہ زبانی جواب دیتے ہیں نہ تحریری جواب دیتے ہیں اور مفت میں ترک واجب کا گناہ اپنے نامۂ اعمال میں لکھوالیتے ہیں یہ سب ناواقفیت کی وجہ سے کرلیتے ہیں، اس لیے جب بھی خط آئے تو فوراً زبانی سلام کا جواب دے دینا چاہیے۔

غیر مسلموں کو سلام کرنے کا طریقہ

فقہاءِ کرام نے لکھا ہے کہ غیر مسلم کو سلام کرنا جائز نہیں، اگر کسی غیر مسلم سے ملاقات ہو اور اسے سلام کرنے کی ضرورت پیش آئے تو سلام کے لیے وہ لفظ استعمال کرلے جو لفظ وہ لوگ خود استعمال کرتے ہیں، لیکن اگر غیر مسلم کسی مسلمان سے ملاقات کے وقت ''السلام علیکم'' کہے تو ان کے جواب میں صرف ''وعلیکم'' کہے اور پورا جواب نہ دے اور یہ لفظ کہتے وقت یہ نیت کرلے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم کو ہدایت کی اور مسلمان بننے کی توفیق ہو[1]۔ اس کی

---

(۱) صحیح البخاری ۵۷/۸ (۶۲۵۸) و ۱۵/۹ (۲۹۲۶) نیز ملاحظہ ہو فقہ حنفی کی مشہور کتاب فتاوی عالمگیریۃ ۳۲۵/۵ کتاب الکراهية/الباب السابع فی السلام وتشمیت العاطس۔

وجہ یہ ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مدینہ منورہ میں اور اس کے آس پاس بڑی تعداد میں یہودی آباد تھے یہ قوم ہمیشہ سے شریر قوم ہے۔ چنانچہ جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب سامنے آتے تو یہ لوگ خباثت سے کام لیتے ہوئے ان کو سلام کرتے ہوئے کہتے: ''السام علیکم'' ''لام'' درمیان سے نکال دیتے تھے اب سننے والا جلدی میں یہی سمجھتا کہ اس نے ''السلام علیکم'' کہا ہے۔ ''سام'' کے معنی عربی زبان میں موت اور ہلاکت کے ہیں۔ ''السام علیکم'' کے معنی ہوئے کہ تمہیں موت آجائے اور تم ہلاک اور تباہ ہوجاؤ ظاہر میں تو سلام کرتے اور حقیقت میں بددعا دیتے تھے۔ کچھ روز تک یہ معاملہ چل گیا، لیکن چند روز کے بعد صحابہ نے سمجھ لیا کہ یہ لوگ جان بوجھ کر درمیان سے لام حذف کر کے ''السام علیکم'' کہتے ہیں [1]۔

ایک یہودی کا سلام کرنے کا واقعہ

ایک مرتبہ یہودیوں کی ایک جماعت نے آکر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح سلام کیا: ''السام علیکم'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جب یہ الفاظ سنے تو ان کو غصہ آگیا اور جواب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''علیکم السام واللعنة'' یعنی تم پر ہلاکت ہو اور لعنت ہو۔ دو لفظ بول دیے۔ حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سن لیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ترکی بترکی جواب دیا ہے تو آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

''مهلا يا عائشة''

اے عائشہ! رک جاؤ اور نرمی سے کام لو۔

---

(۱) صحيح البخاری ۵۷/۸ (۶۲۵۶)۔

پھر فرمایا:

"ان اللہ یحب الرفق فی الامر کلہ"

اللہ تعالیٰ ہر معاملے میں نرمی کو پسند فرماتے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ کیسے گستاخ ہیں کہ آپ سے خطاب کرتے ہوئے "السام علیکم" کہہ رہے ہیں اور ہلاکت کی بددعا کررہے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

اے عائشہ! کیا تم نے نہیں سنا کہ میں نے ان کے جواب میں کیا کہا؟ جب انہوں نے "السام علیکم" کہا تو میں نے جواب میں کہا "وعلیکم" مطلب یہ ہے کہ جو بددعا تم ہمارے لیے کررہے ہو اللہ تعالیٰ وہ تمہارے حق میں قبول کرے (۱)۔

لہٰذا غیر مسلم کے سلام کے جواب میں صرف "وعلیکم" کہنا چاہیے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"یاعائشة: ماکان الرفق فی شیءٍ اِلّا زانه ولانزع عن شیءٍ اِلّا شانه" (۲)

اے عائشہ! نرمی جس چیز میں بھی ہوگی اس کو زینت بخشے گی اور جس چیز سے نکال دی جائے گی اس کو عیب دار کردے گی۔ اس لیے معاملہ حتی الامکان نرمی سے کرنا چاہیے۔ چاہے مقابلے پر کفار ہی ہوں۔

(۱) صحیح البخاری ۵۷/۸(٦٢٥٦) و ۱۲/۸(٦٠٢٤)۔
(۲) صحیح مسلم ۲۰۰٤/٤(٢٥٩٤)۔

حتی الامکان نرمی کرنا چاہیے

آپ دیکھیے کہ یہودی نے حضورِ اقدس ﷺ کے ساتھ گستاخی کی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جو الفاظ جواب میں فرمائے بظاہر وہ انصاف کے خلاف نہیں تھے، لیکن نبی کریم ﷺ نے یہ سکھادیا کہ میری سنّت یہ ہے کہ نرمی کا معاملہ کرو اور صرف اتنی بات زبان سے ادا کرو جتنی ضرورت ہے بلاوجہ اپنی طرف سے بات آگے بڑھا کر سختی کا برتاؤ کرنا اچھی بات نہیں ہے۔

سلام ایک دعا ہے

بہرحال! یہ ''سلام'' معمولی چیز نہیں، یہ زبردست دعا ہے اور اس کو دعا کی نیت سے کہنا اور سننا چاہیے۔ سچی بات یہ ہے کہ اگر ایک آدمی کی بھی دعا ہمارے حق میں قبول ہوجائے تو ہمارا بیڑا پار ہوجائے۔ اس لیے کہ اس دنیا و آخرت کی ساری نعمتیں اس سلام کے اندر جمع ہیں، یعنی تم پر سلامتی ہو۔ اللہ کی رحمت ہو اور اللہ کی برکت ہو اس لیے یہ دعا لوگوں سے لینی چاہیے اور اس شوق اور ذوق میں لینی چاہیے کہ شاید اللہ تعالیٰ اس کی زبان میرے حق میں مبارک کردے۔

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کی حالت

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ بڑے درجے کے اولیاء اللہ میں سے ہیں اور حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے دادا پیر ہیں۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ہیں اور حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ حضرت معروف

کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ہیں ہر وقت ذکر اللہ میں مصروف رہتے تھے کوئی وقت اللہ کے ذکر سے خالی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ حجام سے حجامت بنوا رہے تھے، جب مونچھ بنانے کا وقت آیا تو حجام نے دیکھا کہ زبان حرکت کر رہی ہے اور ہونٹ ہل رہے ہیں۔ حجام نے کہا کہ حضرت! تھوڑی دیر کے لیے منہ بند کر لیجیے۔ تا کہ میں آپ کی مونچھیں بنالوں حضرت نے جواب دیا کہ تم تو اپنا کام کر رہے ہو میں اپنا کام نہ کروں؟ آپ کا یہ حال تھا کہ ہر وقت زبان پر ذکر جاری تھا۔

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

ان کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ سڑک پر سے گزر رہے تھے۔ راستے میں دیکھا کہ ایک سقّہ لوگوں کو پانی پلا رہا ہے اور یہ آواز لگا رہا ہے کہ ''اللہ اس بندے پر رحم کرے جو مجھ سے پانی پیے'' حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ اس سقّے کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ ایک گلاس پانی مجھے بھی پلا دو، چنانچہ اس نے دے دیا، آپ نے پانی لے کر پی لیا ایک ساتھی جو ان کے ساتھ تھے، انہوں نے کہا کہ حضرت آپ تو روزے سے تھے اور آپ نے پانی پی کر روزہ توڑ دیا؟ آپ نے فرمایا کہ یہ اللہ کا بندہ دعا کر رہا تھا کہ اللہ اس بندے پر رحم کرے جو مجھ سے پانی پی لے، مجھے خیال آیا کہ کیا معلوم اللہ تعالیٰ اس کی دعا میرے حق میں قبول فرمالے، نفل روزہ جو توڑ دیا اس کی قضا تو بعد میں کرلوں گا، لیکن بعد میں اس بندے کی دعا مجھے مل سکے گی یا نہیں؟ اس لیے میں نے اس بندے کی دعا لینے کے لیے پانی پی لیا۔[1]

(۱) حلیۃ الاولیاء لابی نعیم ۳۶۵/۸ طبع دار الکتاب العربی۔ بیروت۔

اب آپ اندازہ لگائیے کہ اتنے بڑے اللہ کے ولی، اتنے بڑے بزرگ، اتنے بڑے صوفی، لیکن ایک معمولی سقے کی دعا لینے کے لیے روزہ توڑ دیا۔ کیوں روزہ توڑ دیا؟ اس لیے کہ یہ حضرات اللہ کے بندوں کی دعائیں لینے کے حریص ہوتے ہیں کہ پتہ نہیں کس کی دعاء کس وقت ہمارے حق میں قبول ہوجائے۔

''شکریہ'' کے بجائے ''جزاکم اللہ'' کہنا چاہیے

اسی وجہ سے ہمارے دین میں ہر ہر موقع کے لیے دعائیں تلقین کی گئی ہیں۔ مثلاً چھینکنے والے کے جواب میں کہو: ''یر حمك الله'' اللہ تم پر رحم کرے۔ ملاقات کے وقت ''السلام علیکم'' کہو تم پر سلامتی ہو، کوئی تمہارے ساتھ بھلائی کرے تو کہو ''جزاکم اللہ'' اللہ تعالیٰ تمہیں بدلہ دے۔ آج کل یہ رواج ہوگیا ہے کہ جب کوئی شخص دوسرے کے ساتھ کوئی بھلائی کرتا ہے تو اس کے جواب میں کہتا ہے کہ ''آپ کا بہت بہت شکریہ'' یہ لفظ کہنا یا شکریہ ادا کرنا کوئی گناہ کی بات نہیں، اچھی بات ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ

من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ (1)

جو شخص انسانوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا، وہ اللہ کا شکریہ بھی ادا نہیں کرتا، لیکن شکریہ ادا کرنے کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ جس کا شکر ادا کررہے ہو، اس کو کچھ دعا دے دو، تاکہ اس دعا کے نتیجے میں اس کا فائدہ ہوجائے، کیونکہ اگر آپ نے کہا کہ ''بہت بہت شکریہ'' تو ان الفاظ کے کہنے سے اس کو کیا ملا؟ کیا دنیا یا آخرت

(1) سنن الترمذی ۳/۵۰۵ (۱۹۵۵) وقال ھذا حدیث حسن۔

کی کوئی نعمت مل گئی؟ یا اس کا کوئی فائدہ پہنچا؟ کچھ نہیں ملا، لیکن جب تم نے ''جزاکم اللہ'' کہا تو اس کو ایک دعا مل گئی۔ بہر حال! اسلام میں یہ طریقہ سکھایا گیا کہ قدم قدم پر دوسروں کو دعائیں دو اور دعائیں لو۔ اس لیے ان کو اپنے معمولات میں اور شب و روز کی گفتگو میں شامل کرلینا چاہیے۔ خود بھی ان کی عادت ڈالیں اور بچوں کو بھی بچپن ہی سے ان کلمات کو ادا کرنا سکھائیں۔

سلام کا جواب بلند آواز سے دینا چاہیے

ایک صاحب نے پوچھا کہ سلام کا جواب بلند آواز سے دینا ضروری ہے یا آہستہ آواز سے بھی جواب دے سکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ویسے تو سلام کا جواب دینا واجب ہے، البتہ اتنی آواز سے جواب دینا کہ سلام کرنے والا وہ جواب سن لے، یہ مستحب اور سنّت ہے، لیکن اگر اتنی آہستہ آواز سے جواب دیا کہ مخاطب نے وہ جواب نہیں سنا تو واجب تو ادا ہوجائے گا، لیکن مستحب ادا نہیں ہوگا۔ لہٰذا بلند آواز سے جواب دینے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین
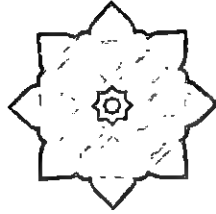
مصافحہ کے آداب

(اصلاحی خطبات ۶/۱۹۸)
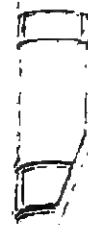
بسم اللہ الرحمن الرحیم

مصافحہ کے آداب

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰہُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ!

”عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ قال: كَانَ النبی ﷺ اِذَا اسْتَقْبَلَهُ الرَّجُلُ فَصَافَحَهُ، لَايَنْزِعُ يَدَهُ مِنْ يَدِهٖ، حَتّٰى يَكُوْنَ الرَّجُلُ الَّذِیْ يَنْزِعُ، وَلَايَصْرِفُ وَجْهَهُ حَتّٰى يَكُوْنَ الرَّجُلُ هُوَ الَّذِیْ يَصْرِفُهُ،

وَلَمْ يُرَ مُقَدِّمًا رُكْبَتَيْهِ بَيْنَ يَدَيْ جَلِيْسٍ لَه"(۱)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خادم خاص۔حضرت انس رضی اللہ عنہ

یہ حدیث حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، یہ وہ صحابی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصیت عطا فرمائی تھی کہ دس سال تک حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خادم رہے، یہ دن رات حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں رہتے تھے ان کی والدہ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا ان کو بچپن میں ہی حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں چھوڑ کر گئی تھیں۔

چنانچہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں رہتے ہوئے ہی انہوں نے ہوش سنبھالا، وہ خود قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ میں نے پورے دس سال تک حضور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کی، لیکن اس پورے دس سال کے عرصے میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ کبھی مجھے ڈانٹا، نہ کبھی مارا اور نہ کبھی مجھ پر غصہ فرمایا اور نہ کبھی میرے کیے ہوئے کام کے بارے میں یہ پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ اور نہ کبھی نہیں کیے ہوئے کام کے بارے میں یہ پوچھا کہ تم نے یہ کیوں نہیں کیا؟ اس شفقت کے ساتھ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی پرورش فرمائی۔(۲)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفقت

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے کسی کام

(۱) سنن الترمذی ٤/٣٦٧ (٢٤٩٠) وقال هذا حديث غريب۔
(۲) صحيح البخاری ٤/١١ (٢٧٦٨) و ٨/١٤ (٦٠٣٤) وصحيح مسلم ٤/١٨٠٤ (٢٣٠٩)۔

کے لیے بھیجا، میں گھر سے کام کرنے کے لیے نکلا، راستے میں دیکھا کہ بچے کھیل رہے ہیں (خود بھی بچے ہی تھے) میں ان بچوں کے ساتھ کھیل میں لگ گیا اور یہ بھول گیا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو مجھے کسی کام کے لیے بھیجا تھا، جب کافی دیر گزر گئی تو مجھے یاد آیا۔ اب مجھے فکر ہوئی کہ میں نے وہ کام تو کیا نہیں اور کھیل میں لگ گیا، چنانچہ میں گھر واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ وہ کام خود حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے انجام دے دیا ہے، مگر آپ نے مجھ سے یہ پوچھا تک نہیں کہ میں نے تم کو فلاں کام کے لیے بھیجا تھا۔ تم نے کیوں نہیں کیا؟ (۱)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دعاؤں کا حصول

خدمت کے دوران حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دعائیں بھی لیں، اس لیے کہ جب بھی کوئی خدمت انجام دیتے، اس پر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر یہ دعا فرمائی کہ اے اللہ! ان کی عمر اور ان کی اولاد میں برکت عطا فرما(۲)، یہ دعا ایسی قبول ہوئی کہ تقریباً تمام صحابہ میں سب سے آخر میں آپ کی وفات ہوئی اور آپ ہی نے بے شمار انسانوں کو تابعی ہونے کا شرف بخشا، آپ کو دیکھ کر آپ کی زیارت کر کے بہت سے لوگ تابعی بن گئے، اگر آپ نہ ہوتے تو ان کو تابعی ہونے کا شرف حاصل نہ ہوتا۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی یقینی طور پر زیارت کی۔ امام اعمش رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی زیارت کی ہے۔ جس کے ذریعے وہ تابعی بن گئے، اتنی لمبی عمر اللہ تعالیٰ نے عطا

---

(۱) صحیح مسلم ۱۸۰۵/۴ (۲۳۱۰)۔
(۲) صحیح البخاری ۸۱/۸ (۶۳۷۸) و صحیح مسلم ۱۹۲۸/۴ (۲۴۸۰)۔

فرمائی اور اولاد میں برکت کا یہ حال تھا کہ اتنی اولاد ہوئی کہ وہ خود فرماتے ہیں ۔
آج میری اولاد اور اولاد کی اولاد کی تعداد سو سے زائد ہو چکی ہے ۔

حدیث کا ترجمہ

بہر حال! حضرت انس رضی اللہ عنہ اس حدیث میں فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب کوئی آپ کے پاس آکر آپ سے مصافحہ کرتا تو آپ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے اس وقت تک نہیں کھینچتے تھے، جب تک وہ خود اپنا ہاتھ نہ کھینچ لے اور اپنا چہرہ اور اپنا رخ اس ملاقات کرنے والے کی طرف سے نہیں پھیرتے تھے جب تک وہ خود اپنا چہرہ نہ پھیر لے اور نہ کبھی یہ دیکھا گیا کہ جب آپ مجلس میں لوگوں کے ساتھ بیٹھے ہوں، تو آپ نے اپنا گھٹنا ان میں سے کسی شخص سے آگے کیا ہو۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تواضع

اس حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تین اوصاف بیان کیے ہیں، پہلا وصف یہ بیان کیا گیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طبیعت میں اس قدر تواضع تھی کہ اتنے بلند مقام پر ہونے کے باوجود جب کوئی اللہ کا بندہ آپ سے ملاقات کرتا تو آپ اپنا ہاتھ اس وقت تک نہیں کھینچتے تھے جب تک وہ خود اپنا ہاتھ نہ کھینچ لے اور دوسرا وصف یہ بیان کیا کہ آپ اپنا چہرہ اس وقت تک نہیں پھیرتے تھے جب تک وہ خود اپنا چہرہ نہ پھیر لے اور تیسرا وصف یہ بیان کیا کہ اپنا گھٹنا کسی سے آگے نہیں کرتے تھے۔ بعض دوسری روایتوں میں آتا ہے کہ جب کوئی شخص آپ

(۱) مسند احمد ٤٥/٤١٤ (٢٧٤٢٦)۔

سے بات کرنا شروع کرتا تو آپ اس کی بات نہیں کاٹتے تھے اور اس وقت تک اس کی طرف متوجہ رہتے تھے جب تک وہ خود ہی اٹھ کر نہ چلا جائے اور اگر کوئی بڑھیا بھی کسی معمولی سے کام کے لیے آپ کو اپنی طرف متوجہ کرتی تو آپ اس کے ساتھ اس کا کام کرنے کے لیے تشریف لے جاتے تھے[1]۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مصافحہ کا انداز

حقیقت میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی جتنی سنتیں ہیں وہ سب ہمارے لیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان پر ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین، لیکن بعض سنتوں پر عمل کرنا آسان ہے اور بعض سنتوں پر عمل کرنا مشکل ہے۔ اس حدیث میں جو سنّت بیان کی گئی ہے کہ آدمی مصافحہ کرنے کے بعد اس وقت تک اپنا ہاتھ نہ کھینچے جب تک دوسرا اپنا ہاتھ نہ کھینچ لے اور جب دوسرا بات شروع کرے تو اس کی بات نہ کاٹے، جب تک وہ خود ہی بات ختم نہ کرے، ایک مشغول انسان کے لیے ساری زندگی اس پر عمل کرنا بظاہر دشوار معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ بعض لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جو اس بات کا خیال کرتے ہیں کہ دوسرے شخص کا زیادہ وقت نہ لیا جائے، لیکن بعض لیچڑ قسم کے لوگ ہوتے ہیں، جب باتیں کرنے بیٹھیں گے تو اب ختم کرنے کا نام ہی نہیں لیں گے، اس قسم کے لوگوں سے ملاقات کے وقت ان کی بات سنتے رہنا اور ان کی بات نہ کاٹنا جب تک وہ خود اپنی بات ختم نہ کرے یہ بڑا مشکل کام ہے، خاص طور پر اس ذات کے لیے جس پر دونوں جہاں کی ذمہ داریاں ہیں، جہاد جاری ہے، تعلیم وتبلیغ کا

[1] ملاحظہ ہو الشمائل المحمدیۃ للترمذی ۲۹۰ (۳۵۲) باب ما جاء فی خُلق رسول اللہ ﷺ. طبع المکتبۃ التجاریۃ۔

سلسلہ جاری ہے، مدینے کی ریاست کا انتظام جس کے سر پر ہے، حقیقت میں تو یہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہی تھا۔

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اس عظیم منصب کے باوجود جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا تھا، آپ کی تواضع اور انکساری کا یہ عالم تھا کہ اللہ کے ہر بندے کے ساتھ تواضع اور عاجزی کے ساتھ پیش آتے تھے۔

دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا سنّت ہے

اس حدیث کے پہلے جملے سے دو مسئلے معلوم ہوئے: پہلا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ ملاقات کے وقت مصافحہ کرنا سنّت ہے۔ احادیث میں اگرچہ مصافحہ کے بارے میں زیادہ تفصیل تو نہیں آئی، لیکن بزرگوں نے فرمایا کہ مصافحے کا وہ طریقہ جو سنّت سے زیادہ قریب ہے، وہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا جائے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے مصافحہ کے بیان پر جو باب قائم کیا ہے اس میں حضرت حماد بن زید رحمۃ اللہ علیہ کا حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا بیان کیا ہے۔ (۱)

ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا خلافِ سنّت ہے

آج کے دور میں ایک طرف تو انگریزوں کی طرف سے فیشن چلا کہ ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا چاہیے، دوسری طرف بعض حلقوں کی طرف سے، خاص طور پر سعودی عرب کے حضرات اس بارے میں تشدد اختیار کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں

(۱) صحیح البخاری ۸/۵۹ کتاب الاستئذان/باب الاخذ بالیدین۔

کہ مصافحہ تو ایک ہی ہاتھ سے کرنا سنّت ہے، دونوں ہاتھوں سے کرنا سنّت نہیں۔ خوب سمجھ لیجیے کہ یہ خیال غلط ہے۔ اس لیے کہ حدیث میں مفرد کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے اور تثنیہ کا لفظ بھی آیا ہے اور بزرگوں نے اس کا جو مطلب سمجھا وہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا سنّت ہے، چنانچہ کسی حدیث میں یہ نہیں آیا ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ایک ہاتھ سے مصافحہ کیا جبکہ روایتوں میں دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنے کا ذکر موجود ہے۔ چنانچہ بزرگانِ دین میں بھی یہی طریقہ متعارف رہا ہے۔اسی طریقے کو علماءِ امت نے سنّت کے قریب سمجھا ہے کہ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا جائے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس ﷺ نے مجھے ''التحیات'' اس طرح یاد کرائی کہ ''کفّـی بیـن کـفیه'' یعنی میرے ہاتھ حضورِ اقدس ﷺ کی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان تھے[1]۔اس سے معلوم ہوا کہ حضورِ اقدس ﷺ کے عہدِ مبارک میں بھی مصافحہ کرنے کا طریقہ یہی تھا اس لیے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا سنّت سے زیادہ قریب ہے۔اب اگر کوئی شخص ایک ہاتھ سے مصافحہ کرلے تو اس کو میں یہ نہیں کہتا کہ اس نے ناجائز کام کیا یا اس سے مصافحہ کی سنّت ادا نہیں ہوگی، لیکن وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو سنّت سے زیادہ قریب ہو اور جس طریقے کو علماء، فقہاء اور بزرگانِ دین نے سنّت سے قریب سمجھ کر اختیار کیا، وہ زیادہ بہتر ہے۔

---

(۱) صحيح البخاري ۵۹/۸ (٦٢٦٥)۔

موقع دیکھ کر مصافحہ کیا جائے

یہ معلوم ہوا کہ مصافحہ کرنا اگرچہ سنّت ضرور ہے، لیکن ہر سنّت کا کوئی محل اور موقع بھی ہوتا ہے، اگر وہ سنّت اس کے موقع پر انجام دی جائے تو سنّت ہوگی اور اس پر عمل کرنے سے ان شاء اللہ ثواب حاصل ہوگا، لیکن اگر اس سنّت کو بے موقع اور بے محل استعمال کرلیا تو ثواب کے بجائے الٹا گناہ کا اندیشہ ہوتا ہے۔ مثلاً اگر مصافحہ کرنے سے سامنے والے شخص کو تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں مصافحہ کرنا درست نہیں اور اگر زیادہ تکلیف ہونے کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں مصافحہ کرنا ناجائز ہے۔ ایسے وقت میں صرف زبان سے سلام کرنے پر اکتفا کرے اور ''السلام علیکم'' کہہ دے اور سامنے والا جواب دے دے۔

یہ مصافحے کا موقع نہیں

مثلاً ایک شخص کے دونوں ہاتھ مصروف ہیں دونوں ہاتھوں میں سامان ہے اور آپ نے ملاقات کے وقت مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیے، ایسے وقت بے چارہ پریشان ہوگا، اب آپ سے مصافحہ کرنے کی خاطر اپنا سامان پہلے زمین پر رکھے اور پھر آپ سے مصافحہ کرے، لہٰذا ایسی حالت میں مصافحہ کرنا سنّت نہیں، بلکہ خلاف سنّت ہے، بلکہ اگر مصافحہ کی وجہ سے دوسرے کو تکلیف پہنچے گی تو گناہ کا بھی اندیشہ ہے۔ آج کل لوگ اس معاملے میں بڑی بے احتیاطی کرتے ہیں۔

مصافحہ کا مقصد ''اظہارِ محبت''

دیکھیے کہ یہ [illegible] محبت کا اظہار ہے اور محبت کے اظہار کے لیے وہ

طریقہ اختیار کرنا چاہیے جس سے محبوب کو راحت ملے نہ یہ کہ اس کے ذریعے اس کو تکلیف پہنچائی جائے۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی بزرگ اللہ والے کسی جگہ پہنچے تو آپ لوگوں نے یہ سوچا کہ چونکہ یہ بزرگ ہیں ان سے مصافحہ کرنا ضروری ہے، چنانچہ مصافحہ کرنے کے لیے پورا مجمع ان بچارے ضعیف اور چھوئی موئی بزرگ پر ٹوٹ پڑا، اب اندیشہ اس کا ہے کہ وہ بزرگ گر پڑیں گے ان کو تکلیف ہوگی، لیکن مصافحہ نہیں چھوڑیں گے، ذہن میں یہ ہے کہ مصافحہ کر کے برکت حاصل کرنی ہے اور جب تک یہ برکت حاصل نہیں ہوگی ہم یہاں سے نہیں جائیں گے۔

اس وقت مصافحہ کرنا گناہ ہے

خاص طور پر یہ بنگال اور برما کا جو علاقہ ہے اس میں یہ رواج ہے کہ اگر کسی بزرگ کا وعظ اور بیان سنیں گے تو وعظ کے بعد بزرگ سے مصافحہ کرنا لازم اور ضروری سمجھتے ہیں، چنانچہ وعظ کے بعد ان بزرگ پر ٹوٹ پڑیں گے، اس کا خیال نہیں ہوگا کہ جن سے مصافحہ کر رہے ہیں وہ کہیں دب نہ جائیں ان کو تکلیف نہ پہنچ جائے، لیکن مصافحہ کرنا ضروری ہے۔

پہلی مرتبہ جب اپنے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بنگال جانا ہوا تو پہلی بار یہ منظر دیکھنے میں آیا کہ جلسے میں ہزار ہا افراد کا مجمع تھا۔ حضرت والد صاحب نے بیان فرمایا، لیکن جب جلسے سے فارغ ہوئے تو سارا مجمع مصافحہ کے لیے والد صاحب پر ٹوٹ پڑا اور والد صاحب کو وہاں سے بچا کر نکالنا مشکل ہوگیا۔

یہ تو دشمنی ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک وعظ ہے جو آپ نے رنگون (برما) کی سورتی مسجد میں کیا تھا، اس وعظ میں یہ لکھا ہے کہ جب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ وعظ سے فارغ ہوئے تو مصافحہ کرنے کے لیے مجمع کا اتنا زور پڑا کہ حضرت والا گرتے گرتے بچے۔ یہ حقیقی محبت نہیں ہے یہ محض صورتِ محبت ہے، اس لیے کہ محبت کو بھی عقل چاہیے کہ جس سے محبت کی جارہی ہے اس کے ساتھ ہمدردی کا معاملہ کیا جائے اور اس کو دکھ اور تکلیف سے بچایا جائے، یہ ہے حقیقی محبت۔

عقیدت کی انتہا کا واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک بزرگ کسی علاقے میں چلے گئے، وہاں کے لوگوں کو ان بزرگ سے اتنی عقیدت ہوئی کہ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ان بزرگ کو اب باہر نہیں جانے دیں گے، ان کو یہیں رکھیں گے تاکہ ان کی برکت حاصل ہو اور اس کی صورت یہ سمجھ میں آئی کہ ان بزرگ کو قتل کر کے یہاں دفن کر دیا جائے تاکہ ان کی یہ برکت اس علاقے سے باہر نہ نکل جائے۔

جوشِ محبت میں بے عقلی کا جو انداز ہے اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں، محبت وہ ہے جس سے محبوب کو راحت اور آرام ملے۔ اسی طرح مصافحہ کے وقت یہ دیکھ کر مصافحہ کرنا چاہیے کہ اس وقت مصافحہ کرنا مناسب ہے یا نہیں؟ اس کا لحاظ رکھنا چاہیے، اگر دونوں ہاتھ مشغول ہوں تو ایسی صورت میں راحت اور آرام کی نیت سے مصافحہ نہ کرنے میں زیادہ ثواب حاصل ہوگا۔ ان شاء اللہ۔

مصافحہ کرنے سے گناہ جھڑتے ہیں

ایک حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے محبت کے ساتھ مصافحہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ دونوں کے ہاتھ کے گناہ جھاڑ دیتے ہیں[1]، لہٰذا مصافحہ کرتے وقت یہ نیت کر لینی چاہیے کہ اس مصافحے کے ذریعے اللہ تعالیٰ میرے گناہوں کی بھی مغفرت فرمائیں گے اور ان کے بھی گناہوں کی مغفرت فرمائیں گے اور ساتھ میں یہ نیت بھی کر لے کہ یہ اللہ کا نیک بندہ جو مجھ سے مصافحہ کرنے کے لیے آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ کی برکت میری طرف منتقل فرما دیں گے۔ خاص طور پر ہم جیسے لوگوں کے ساتھ ایسے مواقع بہت پیش آتے ہیں کہ جب کسی جگہ پر وعظ یا بیان کیا تو وعظ کے بعد لوگ مصافحے کے لیے آ گئے۔

ایسے موقع کے لیے ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ بھائی، جب بہت سارے لوگ مجھ سے مصافحہ کرنے کے لیے آتے ہیں تو میں بہت خوش ہوتا ہوں اس لیے خوش ہوتا ہوں کہ یہ سب اللہ کے نیک بندے ہیں کچھ پتہ نہیں کہ کون سا بندہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول بندہ ہے جب اس مقبول بندے کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھو جائے گا تو شاید اس کی

---

(۱) للعجم الاوسط للطبرانی ۸۴/۱ (۲۴۵) وقال الهیثمی فی "مجمع الزوائد" ۸/ ۷۵ (۱۲۷۶۶): رواه الطبراني في الأوسط، ويعقوب بن محمد بن الطحلاء روى عنه غير واحد ولم يضعفه أحد، وبقية رجاله ثقات. وأصله في سنن الترمذي ٤/٤٤٧ (٢٧٢٧) من حديث البراء بن عازب ولفظه: «ما من مسلمين يلتقيان، فيتصافحان إلا غفر لهما قبل أن يفترقا». وقال: هذا حديث حسن غريب من حديث أبي إسحاق عن البراء.

برکت سے اللہ تعالیٰ مجھ پر بھی نوازش فرما دیں۔ یہی باتیں بزرگوں سے سیکھنے کی ہیں۔ اس لیے جب بہت سے لوگ کسی سے مصافحہ کے لیے آئیں تو اس وقت آدمی کا دماغ خراب ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے اور یہ خیال ہوتا ہے کہ جب اتنی ساری مخلوق مجھ سے مصافحہ کر رہی ہے اور میری معتقد ہو رہی ہے، واقعتاً اب میں بھی بزرگ بن گیا ہوں، لیکن جب مصافحہ کرتے وقت یہ نیت کرلی کہ شاید ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ مجھے نواز دیں۔ میری بخشش فرما دیں تو اب سارا نقطۂ نظر تبدیل ہوگیا اور اب مصافحہ کرنے کے نتیجے میں تکبر اور اپنی بڑائی پیدا ہونے کے بجائے تواضع اور عاجزی اور شکستگی، انکساری پیدا ہوگئی، لہٰذا مصافحہ کرتے وقت یہ نیت کرلیا کرو۔

مصافحہ کرنے کا ایک ادب

حدیث کے اگلے جملے میں یہ بیان فرمایا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی شخص سے مصافحہ کے وقت اپنا ہاتھ اس وقت تک نہیں کھینچتے تھے جب تک سامنے والا شخص اپنا ہاتھ نہ کھینچ لے۔ اس سے مصافحہ کرنے کا ایک اور ادب معلوم ہوا کہ آدمی مصافحہ کرتے وقت اپنا ہاتھ خود سے نہ کھینچے، یعنی سامنے والے کو اس بات کا احساس نہ ہو کہ تم اس کی ملاقات سے اکتا رہے ہو یا تم اس کو حقیر اور ذلیل سمجھ رہے ہو، بلکہ شگفتگی کے ساتھ مصافحہ کرے۔ جلد بازی نہ کرے، البتہ اگر کوئی شخص ایسا ہو جو چمٹ ہی جائے اور آپ کا ہاتھ چھوڑے ہی نہیں، اس وقت بہر حال اس کی گنجائش ہے کہ آپ اپنا ہاتھ کھینچ لیں۔

ملاقات کا ایک ادب

اس حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ کا دوسرا وصف یہ بیان فرمایا کہ آپ ملاقات کے وقت اپنا چہرہ اس وقت تک نہیں پھیرتے تھے جب تک کہ سامنے والا اپنا چہرہ نہ پھیر لے۔ یہ بھی حضورِ اقدس ﷺ کی سنّت ہے اس سنّت پر عمل کرنے میں بڑا مجاہدہ ہے، لیکن انسان کی اپنی طرف سے یہی کوشش ہونی چاہیے کہ جب تک ملاقات کرنے والا خود ملاقات کر کے رخصت نہ ہو جائے اس وقت تک اپنا چہرہ اس سے نہ پھیرے، البتہ اگر کہیں مجبوری ہو جائے تو بات دوسری ہے۔

عیادت کرنے کا عجیب واقعہ

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ کا واقعہ لکھا ہے کہ جب آپ مرض الوفات میں تھے، لوگ آپ کی عیادت کرنے کے لیے آنے لگے۔ عیادت کے بارے میں حضورِ اقدس ﷺ کی تعلیم یہ ہے کہ

اعظم العيادة اجرا اخفها (۱)

یعنی سب سے زیادہ اجر والی عیادت وہ ہے جو زیادہ ہلکی

(۱) مسند البزار ۲/۲۵۵ (٦٦٣) وقال: وأحسب أن ابن أبي فديك لم يسمع من علي بن عمر بن علي بن أبي طالب، والكلام فلا نحفظه عن النبي ﷺ إلا من هذا الوجه. وأورده الهيثمي في "المجمع" ۳/۲۰ (۳۷٦۲) واكتفى على كلام البزار. والحديث مذكور في "الجامع الصغير" ۱/۲۵۷ (۱۱۸۱) برمز الضعف. وقال المناوي في "فيض القدير" ۲/۳ (۱۱۸۱): وقد أشار المصنف بضعفه فإما أن يكون لانقطاعه، ولكونه مع الانقطاع فيه علة أخرى.

ہلکی ہو۔

بیمار کے پاس زیادہ دیر نہ بیٹھے، کیونکہ بعض اوقات مریض کو خلوت کی ضرورت ہوتی ہے اور لوگوں کی موجودگی میں وہ اپنا کام بے تکلفی سے انجام نہیں دے سکتا، اس لیے مختصر عیادت کر کے چلے آؤ اس کو راحت پہنچاؤ، تکلیف مت پہنچاؤ۔ بہر حال! حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ بستر پر لیٹے ہوئے تھے ایک صاحب عیادت کے لیے آکر بیٹھ گئے اور ایسے جم کر بیٹھ گئے کہ اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے اور بہت سے لوگ عیادت کے لیے آتے رہے اور مختصر ملاقات کر کے جاتے رہے، مگر وہ صاحب بیٹھے رہے نہ اٹھے حضرت عبداللہ بن مبارک اس انتظار میں تھے کہ یہ صاحب چلے جائیں تو میں خلوت میں بے تکلفی سے اپنی ضروریات کے کچھ کام کرلوں۔ مگر خود سے اس کو چلے جانے کے لیے کہنا بھی مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ جب کافی دیر گزر گئی اور اللہ کا بندہ اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا تو حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے ان صاحب سے فرمایا کہ یہ بیماری کی تکلیف تو اپنی جگہ پر ہے ہی، لیکن عیادت کرنے والوں نے علیحدہ پریشان کر رکھا ہے کہ عیادت کے لیے آتے ہیں اور پریشان کرتے ہیں۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ شاید یہ میری بات سمجھ کر چلا جائے، مگر وہ اللہ کا بندہ پھر بھی نہیں سمجھا اور حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ سے کہا کہ حضرت! اگر آپ اجازت دیں تو کمرے کا دروازہ بند کردوں؟ تاکہ کوئی دوسرا شخص عیادت کے لیے نہ آئے، حضرت عبداللہ بن مبارک نے جواب دیا: ہاں بھائی بند کردو، مگر اندر سے بند کرنے کے بجائے باہر سے جا کر بند کردو[1]۔

---

(۱) اس طرح کا واقعہ بغیر کسی نسبت کے ملا علی قاری نے مرقاۃ المفاتیح ۳/۱۱۵۳ میں نقل کیا ہے۔(طبع دار الفکر)۔ واللہ اعلم۔

بہر حال! بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے ساتھ ایسا معاملہ بھی کرنا پڑتا ہے، اس کے بغیر کام نہیں چلتا، لیکن عام حالت میں حتی الامکان یہ کوشش کی جائے کہ دوسرا آدمی یہ محسوس نہ کرے کہ مجھ سے اعراض برتا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو ان سنتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

ملاقات اور فون کرنے کے آداب

(اصلاحی خطبات ۱۷/ ۲۵۴)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ملاقات اور فون کرنے کے آداب

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ○ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا

لهم والله غفور رحيم[1]

امنت بالله صدق الله مولانا العظيم، وصدق رسوله النبي الكريم، ونحن على ذالك من الشاهدين والشاكرين، والحمد لله رب العالمين۔

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! سورۂ حجرات کی تفسیر کا بیان کئی جمعوں سے چل رہا ہے، آج میں نے آپ کے سامنے اس کی دو آیات تلاوت کیں، ان میں سے پہلی آیت میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے حجروں یعنی رہائش گاہ کے پیچھے سے پکارتے ہیں ان میں سے اکثر لوگ ناسمجھ ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ بنوتمیم کا ایک وفد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تھا، ان کے اندر آداب وتہذیب کی کمی تھی، چنانچہ ان لوگوں نے اس وقت جب کہ آپ کے آرام کا وقت تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکان کے پیچھے سے آپ کو پکارنا شروع کردیا کہ ''یا محمد اخرج الینا'' اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)! آپ باہر تشریف لائیں، ہم آپ سے ملنے آئے ہیں، یہ آیتِ کریمہ اُن کے بارے میں نازل ہوئی[2]، جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حجروں کے پیچھے سے پکار رہے ہیں ان میں سے اکثر لوگ ناسمجھ ہیں، اگر یہ لوگ آپ کو پکارنے کے بجائے باہر صبر کرتے اور انتظار کرتے،

---

(۱) سورۃ الحجرات آیت (۵)۔

(۲) الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز للواحدی ص۱۰۱۶ سورۃ الحجرات۔ طبع دار القلم دمشق، وتفسیر الثعلبی ۷۶/۹ طبع دار احیاء التراث العربی، وتفسیر السمعانی ۲۱۵/۵ طبع دار الوطن الریاض۔

یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود باہر تشریف لے آتے تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا، لیکن ساتھ میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمادیا کہ چونکہ یہ عمل ان سے نادانی میں سرزد ہوا ہے، اس لیے ان کو معاف کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ بڑا غفور و رحیم ہے، بڑا مغفرت کرنے والا ہے، رحم کرنے والا ہے، لیکن آئندہ کے لیے سبق دے دیا۔

دور سے بلانا ادب کے خلاف ہے

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو سبق دیے: ایک سبق یہ دیا کہ کسی بڑے کو دور سے پکارنا بے ادبی ہے، چاہے یہ پکارنا گھر کے باہر سے ہو یا کسی اور جگہ سے ہو، اگر کسی بڑے سے آپ کو کوئی کام ہے تو اس کے قریب جاکر اس سے بات کریں، بلکہ عام انسانوں میں بھی یہ بے ادبی کی بات ہے، مثلاً کوئی بیٹا باپ کو اس طرح دور سے پکارے یا کوئی شخص اپنے سے بڑے رشتے دار کو دور سے پکارے، یہ سب بے ادبی کے اندر داخل ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں تو یہ بے ادبی بڑی ہی سنگین ہے، اسی لیے قرآنِ کریم نے یہ طریقہ بتادیا کہ دور سے آواز دینے کے بجائے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب جاؤ اور پھر جو درخواست کرنی ہو" یا رسول اللہ!" کہہ کر درخواست کرو۔

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود و سلام کا طریقہ

فقہاءِ کرام نے اسی آیت سے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا سے تشریف لے جانے کے باوجود اپنی قبر مبارک میں تشریف فرما ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک خاص قسم کی حیات حاصل ہے، جس طرح شہداء کے بارے

میں فرمایا کہ وہ مرتے نہیں ہیں، بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن تمہیں احساس نہیں ہوتا۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کا معاملہ شہداء سے بھی اونچا ہے، وہ بھی زندہ ہیں اور خاص قسم کی زندگی اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرما رکھی ہے، جو ہمیں محسوس نہیں ہوتی۔ اسی لیے ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب تم حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر جاؤ تو وہاں جا کر کہو:

الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ

یعنی حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے سلام پیش کرو، لیکن جب تم روضۂ اقدس سے دور ہو تو پھر تم یوں کہو:

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ

لہٰذا اس آیت کی رو سے روضۂ اقدس سے دور ہونے کی صورت میں ''الصلاۃ والسلام علیک یا رسول اللہ'' کہنا درست نہیں، کیونکہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دور سے پکارنا بے ادبی کی بات ہے اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کے خلاف ہے۔

حاضر و ناظر کے عقیدے سے پکارنا

خاص طور پر ''الصلاۃ والسلام علیک یا رسول اللہ'' کے الفاظ سے اس عقیدے سے پکارنا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ موجود ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم حاضر و ناظر ہیں۔ اللہ بچائے۔ یہ عقیدہ انسان کو بعض اوقات شرک تک پہنچا دیتا ہے اور اگر اس عقیدے سے یہ الفاظ کسی نے کہے کہ جب ہم ''الصلاۃ والسلام علیک یا رسول اللہ'' کہہ کر درود بھیجتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی

روحِ مبارک تشریف لاتی ہے۔ خوب سمجھ لیجیے! یہ بات احادیث میں کہیں ثابت نہیں۔ دوسری طرف یہ آپ ﷺ کی تعظیم کے خلاف ہے کہ ہم حضورِ اقدس ﷺ کو دور سے سلام کریں اور سلام لینے کے لیے حضور اکرم ﷺ خود تشریف لائیں۔ یہ کوئی ادب کی بات ہے؟ یہ کوئی تعظیم اور محبت کی بات ہے؟ صحیح طریقہ وہ ہے جو حضورِ اکرم ﷺ نے خود بیان فرمادیا، وہ یہ کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص میری قبر پر آکر مجھے سلام کرے گا، میں اس کا جواب دوں گا اور جو شخص دور سے مجھ پر درود بھیجے گا تو وہ درود مجھ تک پہنچایا جاتا ہے کہ آپ کے فلاں امتی نے درود شریف کا یہ تحفہ پیش کیا ہے۔ یہ حضورِ اقدس ﷺ کا ارشاد ہے، جو حدیث میں منقول ہے۔[1]

''یا رسول اللہ'' کہنا ادب کے خلاف ہے

لہٰذا آپ ﷺ کی ظاہری زندگی میں جس طرح یہ حکم تھا کہ جو شخص بھی آپ سے خطاب کرے، وہ قریب جاکر کرے، دور سے نہ کرے، اسی طرح آپ ﷺ کی وفات کے بعد آپ ﷺ کو قبرِ مبارک میں دوسری حیاتِ طیبہ حاصل ہے، وہاں بھی یہی حکم ہے کہ قریب جاکر ان الفاظ سے سلام کرو کہ

الصلاۃ والسلام علیك یا رسول اللہ

لیکن دور سے کہنا ہے تو درود شریف پڑھو، ان الفاظ سے سلام کہنا آپ ﷺ کی تعظیم اور ادب کے خلاف ہے، اس آیت سے ایک سبق تو یہ دے دیا۔

---

(۱) شعب الایمان للبیهقی ۳/۱۴۰ (۱۴۸۱)، والحدیث ذکره الحافظ ابن حجر فی "فتح الباری" ۶/۴۸۸ معزوا إلی أبی الشیخ فی کتاب الثواب وقال: "بسند جید" نیز ملاحظہ ہو علامہ سخاوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "الاجوبۃ المرضیۃ" ۳/۹۲۸ (۳۵۳) طبع دار الرایۃ.

حضورِ اقدس ﷺ کے دروازے پر دستک دینا

اس آیت سے دوسرا سبق یہ دیا گیا کہ اگر کسی شخص کو حضورِ اکرم ﷺ سے کوئی کام ہے تو آپ ﷺ کے دروازے پر دستک دے کر آپ کو باہر بلانا آپ ﷺ کے ادب کے خلاف ہے، اگر کوئی بہت ضروری اور فوری کام ہو تو دوسری بات ہے، لیکن عام حالات میں آپ ﷺ کے دروازے پر دستک دینا اور آپ ﷺ کو باہر آنے کی زحمت دینا مناسب نہیں، لہٰذا اگر آپ سے کسی شخص کو کوئی کام ہے تو باہر بیٹھ کر انتظار کرے، جب حضورِ اقدس ﷺ خود کسی ضرورت سے باہر تشریف لائیں، ظاہر ہے پانچ وقت کی نماز کے لیے تو آپ ﷺ باہر تشریف لاتے ہی تھے، اس کے علاوہ اور اوقات میں بھی بعض مرتبہ آپ ﷺ باہر تشریف لے آتے تھے، اُس وقت ملاقات کر کے اپنی ضرورت پیش کرو، یہ طریقہ تمہارے لیے ہزار درجہ بہتر ہے، چنانچہ فرمایا:

وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ

یعنی اگر یہ لوگ صبر کر لیتے، یہاں تک کہ آپ ﷺ خود باہر تشریف لے آتے تو یہ ان کے لیے بہتر ہوتا، بنسبت اس کے کہ حضور اکرم ﷺ کو آواز دے کر باہر بلائیں۔

استاد کے دروازے پر دستک دینا

حضرات مفسرین نے اس آیت کے تحت یہ فرمایا کہ شاگرد اور استاد کا معاملہ بھی ایسا ہے، یعنی اگر کوئی شاگرد کسی استاد سے ملاقات کرنا چاہتا ہے تو بجائے اس کے کہ وہ شاگرد استاد کی خلوت میں خلل انداز ہو اور استاد کے

دروازے پر دستک دے کر اس کو باہر آنے کی دعوت دے۔ بہتر یہ ہے کہ اس کا انتظار کرے اور جب وہ استاد خود سے باہر آئے، اس وقت جا کر ملاقات کرے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصی دعا

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی تھے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو اس وقت ان کی عمر صرف دس سال تھی، لیکن دس سال کی عمر کے دوران ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو بلا کر ان کے سر پر ہاتھ رکھ کر یہ دعا فرمائی تھی کہ

اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاوِيْلَ (۱)

اے اللہ! اس (بچے) کو دین کی سمجھ عطا فرما اور اس کو قرآنِ کریم کی تفسیر کا علم عطا فرما۔

چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعا اس طرح قبول فرمائی کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہوگیا تو مجھے یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو دنیا سے تشریف لے جا چکے ہیں اور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کی تفسیر کا علم حاصل نہ کرسکا، دل میں خیال آیا کہ ابھی بہت سے ایسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم موجود ہیں جنہوں نے براہِ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے علم حاصل کیا، میں ان میں سے ایک ایک کے پاس جاؤں اور جا کر ان سے علم

---

(۱) الشریعۃ للآجری ۲۲۶۶/۵ (۱۷۴۸) طبع دار الوطن، البتہ بعض روایات میں کندھے پر ہاتھ رکھنے کا ذکر بھی ملتا ہے ملاحظہ ہو مسند احمد ۲۲۵/۴ (۲۳۹۷) والطبقات الکبریٰ لابن سعد ۲۲۳/۶۔ اور اس کی اصل صحیح بخاری ۴۱/۱ (۱۴۳) پر ہے۔ از مرتب

حاصل کروں، چنانچہ جس کسی صحابی کے بارے میں مجھے علم ہوتا کہ ان کے پاس رسول اللہ ﷺ کی احادیث ہیں تو میں سفر کر کے ان کے پاس جاتا۔

علم سیکھنے کے لیے ادب کا لحاظ

خود فرماتے ہیں کہ بسا اوقات ایسا ہوتا کہ شدید گرمی کا موسم ہے اور عرب کی گرمی تو بہت زیادہ شدید ہوتی تھی، ایسا معلوم ہوتا کہ آسمان سے آگ برس رہی ہے اور زمین شعلے اگل رہی ہے، ایسی شدید گرمی میں سفر کر کے جاتا اور جس صحابی سے علم حاصل کرنا مقصود ہوتا، اس صحابی کے دروازے پر جا کر بیٹھ جاتا، یہ پسند نہیں تھا کہ جس صحابی کو اپنا استاد بنانا ہے اور ان سے حضورِ اقدس ﷺ کی احادیث حاصل کرنی ہیں، ان کو آواز دے کر باہر بلاتا، بلکہ میں ان کے دروازے پر بیٹھ جاتا کہ جب وہ خود سے کسی وقت گھر سے باہر نکلیں گے تو ان سے اپنی درخواست پیش کروں گا اور جب میں دروازے پر بیٹھا ہوتا تو ریت کا طوفان چل رہا ہوتا، سر سے لے کر پاؤں تک پورا جسم مٹی سے اَٹ جاتا، لیکن اس وقت بھی یہ گوارا نہیں ہوتا کہ میں دستک دے کر ان کو باہر بلاؤں اور جب وہ خود کسی وجہ سے باہر نکلتے اور دیکھتے کہ حضورِ اقدس ﷺ کے چچا زاد بھائی اس طرح دروازے پر بیٹھے ہوئے ہیں تو وہ مجھے سینے سے لگاتے اور کہتے کہ آپ تو حضورِ اقدس ﷺ کے چچا کے بیٹے ہیں، آپ یہاں میرے گھر کے دروازے پر بیٹھے ہیں؟ آپ نے دستک دے کر مجھے کیوں نہیں بلالیا؟ اور گھر کے اندر کیوں تشریف نہیں لائے؟ میں عرض کرتا کہ آج میں آپ کے پاس حضور اکرم سرورِ دو عالم ﷺ کے چچا کے بیٹے کی حیثیت سے نہیں آیا، بلکہ آج میں آپ کے شاگرد کی حیثیت سے آیا ہوں اور آپ سے حضورِ اقدس ﷺ کی

باتیں سننے کے لیے آیا ہوں، اس وجہ سے مجھے یہ گوارا نہیں تھا کہ آپ کو تکلیف دوں اور آپ کو گھر سے باہر بلاؤں۔ چونکہ قرآنِ کریم نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کہا تھا کہ بنو تمیم کے لوگوں کو چاہیے تھا کہ وہ باہر دروازے پر صبر کرتے، تو یہ ان کے لیے بہتر ہوتا۔ اس لیے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اپنے استاد کے ساتھ وہی معاملہ کیا۔ (۱)

جانے سے پہلے وقت لے لو

یہ تو استاد شاگرد، باپ بیٹے اور پیر مرید کے بارے میں اصول تھا، لیکن عام انسانوں کے ساتھ ملاقاتوں میں بھی تلقین کی گئی کہ جس شخص سے تم ملنے جارہے ہو، حتی الامکان اس کو تکلیف پہنچانے سے گریز کرو، یہ نہ ہو کہ بس کسی بھی وقت مصیبت بن کر کسی کے گھر میں وارد ہوگئے اور اس پر مسلط ہوگئے، بلکہ جب کسی کے پاس ملاقات کے لیے جانا ہو تو پہلے یہ دیکھو کہ یہ وقت اس شخص سے ملاقات کے لیے مناسب ہے یا نہیں؟ اس شخص کا نظام الاوقات کیا ہے؟ لوگوں کی عادتیں مختلف ہوتی ہیں، کوئی وقت کسی شخص کے آرام کا ہوتا ہے، کسی وقت کوئی شخص خلوت اور تنہائی میں اپنے گھر والوں کے پاس رہنا چاہتا ہے، کوئی شخص کسی وقت مصروف ہوتا ہے، لہٰذا پہلے یہ معلوم کرلو کہ فلاں شخص سے ملاقات کے لیے کون سا وقت زیادہ موزوں ہے؟ کہ اس وقت ملاقات کرنے سے اس کو تکلیف نہیں ہوگی۔

(۱) فضائل الصحابة لاحمد بن حنبل ۹۷۶/۲ (۱۹۲۵) طبع موسسه الرسالة۔ وسنن الدارمی ٤٦٧/١ (٥٩٠) طبع دار المغنی السعودية. والمستدرك للحاكم ١٨٨/١ (٣٦٣) وقال: هذا حديث صحيح على شرط البخاري، وهو أصل في طلب الحديث وتوقير المحدث، ووافقه الذهبي في "ال...

میزبان کے حقوق مہمان پر

جس طرح مہمان کے حقوق ہیں میزبان پر کہ جب کوئی مہمان آئے تو میزبان کو چاہیے کہ اس کا اکرام کرے، اس کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آئے، اسی طرح میزبان کا بھی مہمان کے اوپر حق ہے، وہ یہ ہے کہ مہمان اس کے لیے مہمان بنے، وبالِ جان نہ بنے کہ ایسے وقت میں اس کے پاس پہنچ جائے جو اس کے لیے مناسب نہیں تھا، لہٰذا علماءِ کرام نے اس آیت کے تحت یہ مسئلہ بھی لکھا ہے کہ جب کسی سے ملنے کے لیے جاؤ تو یہ اندازہ کر کے جاؤ کہ اس وقت اس سے ملنا مناسب ہوگا یا نہیں؟ اس کے بغیر اگر جاؤ گے تو تکلیف کا سبب بنو گے اور اللہ تعالیٰ نے سورۃ النور میں دو رکوع اس موضوع پر نازل فرمائے ہیں کہ جب تم کسی سے ملاقات کے لیے جاؤ تو کس طرح جاؤ، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی کے پاس جانے سے اس کو تکلیف نہ دو، جانے سے پہلے اجازت لو کہ میں فلاں وقت میں آؤں یا نہ آؤں؟ اور اگر دوسرا شخص معذرت کرلے میں اس وقت مشغول ہوں، میں ملاقات نہیں کرسکتا تو اس کا برا نہ مناؤ، قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ [1]

یعنی اگر میزبان تم سے یہ کہے کہ اس وقت ملنا میرے لیے مشکل ہے، میں کسی کام میں مشغول ہوں، میرے ساتھ معذوری لاحق ہے تو اس سے برا نہ مناؤ، بلکہ واپس چلے جاؤ، تمہارے لیے واپس جانا ہی بہتر ہے۔ ان تمام اصولوں

(۱) سورۃ النور آیت (۲۸)۔

کی بنیاد یہ ہے کہ تمہارے کسی عمل سے کسی شخص کو کوئی ناواجبی تکلیف نہ پہنچے۔ یہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت ہے۔

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک واقعہ

ایک مرتبہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی صحابی سے ملنے کے لیے تشریف لے گئے، وہ صحابی مدینہ منورہ سے دو تین میل کے فاصلے پر رہتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب کسی صحابی سے ملنے کے لیے اس کے گھر تشریف لے جاتے تو اجازت طلب کرنے کے لیے سلام کرتے کہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، أأدخل؟ کیا میں اندر آجاؤں؟ بہرحال! ان صحابی کے گھر کے دروازے پر پہنچ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسبِ معمول سلام کیا، اندر سے کوئی جواب نہ آیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ سلام کیا، پھر بھی کوئی جواب نہیں آیا۔ آپ نے تیسری مرتبہ سلام کیا، پھر بھی کوئی جواب نہ آیا۔ وہ صحابی کسی اور حال میں تھے، ان کے دل میں خیال آیا کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مجھے دعا دے رہیں، اس لیے کہ ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' کے معنی ہیں کہ تم پر اللہ تعالیٰ کی سلامتی ہو، تم پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو۔ تو ان صحابی نے یہ سوچا کہ میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ سے زیادہ دعائیں حاصل کرلوں، اس لیے وہ اپنے گھر سے باہر نہیں نکلے۔

دوسری طرف جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ سلام کر لیا تو واپس جانے لگے، اس لیے کہ حکم یہ ہے کہ جب تین مرتبہ اجازت مانگ چکو اور تمہیں یہ اندازہ ہو کہ تمہاری آواز اندر والے نے سن لی ہے تو تین مرتبہ اجازت مانگنے کے باوجود اگر وہ باہر نہ نکلے تو تم واپس چلے جاؤ، اس لیے کہ وہ شخص تم سے اس وقت نہیں ملنا چاہتا اور خواہ مخواہ زبردستی دوسرے پر سوار ہوجانا اسلامی آداب کا تقاضہ

نہیں ہے، اس لیے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس جانے لگے۔ جب ان صحابی کو اندازہ ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس تشریف لے جارہے ہیں تو جلدی سے گھر سے باہر نکلے اور جاکر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات کی اور عرض کیا کہ آپ واپس کیوں جارہے ہیں؟ گھر کے اندر تشریف لائیں۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "حکم یہ ہے کہ تین مرتبہ اجازت مانگو اور جب یہ اندازہ ہو کہ اس شخص نے تمہاری آواز سن لی ہے اس کے باوجود وہ اندر آنے کی اجازت نہیں دے رہا، تو واپس چلے جاؤ۔" اب دیکھیے! حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بُرا نہیں منایا اور یہ نہیں کہا کہ تم نے دروازہ کیوں نہیں کھولا اور اندر آنے کی اجازت کیوں نہیں دی، بلکہ واپس چلے گئے، ان صحابی نے فرمایا میں یہ سوچتا رہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعائیں لیتا رہوں، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ دعائیں لینے کا یہ طریقہ نہیں ہوتا، تم دعائیں ویسے لے لیتے، میں باہر کھڑا انتظار کرتا رہا، یہ اچھی بات نہیں ہے[1]۔

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے برا نہیں منایا

بہرحال! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین مرتبہ اجازت طلب کرنے کے بعد جب اجازت نہیں ملی تو اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے برا نہیں منایا اور نہ غصہ کیا کہ ہم تمہارے گھر پر آئے تم نے ہمارے سلام کا جواب نہیں دیا، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس چلے گئے، اس لیے کہ قرآنِ کریم نے یہ فرمادیا تھا کہ اگر تم سے یہ کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو اس وقت تم واپس چلے جاؤ، یہی

(۱) الأدب المفرد ص ٦٠١ (١٠٧٣) مكتبة المعارف الرياض، وأصله فى صحيح البخارى ٨/٥٤ (٦٢٤٥) وصحيح مسلم ٣/١٦٩٥ (٢١٥٣).

تمہارے حق میں بہتر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مہمان پر بھی میزبان کے کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں، وہ یہ کہ بلا وجہ اس کو تکلیف نہ پہنچائے۔

فون کرنے کے آداب

آج کل ملاقاتوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا ہے اور وہ ٹیلی فون کے ذریعے آدھی ملاقات ہے، اس میں بھی یہی احکام ہیں۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے معارف القرآن میں سورۃ النور کی تفسیر میں ٹیلی فون استعمال کرنے کے احکام بھی لکھے ہیں، وہ یہ کہ جب تم کسی کو ٹیلی فون کرو، تو یہ دیکھو کہ میں ایسے وقت میں ٹیلی فون تو نہیں کر رہا ہوں جو اس کی تکلیف کا سبب ہو، بسا اوقات لوگ اس کا خیال نہیں کرتے، بس دماغ میں خیال آیا کہ فلاں سے فلاں بات کرنی ہے اور اسی وقت فون کر دیا، یہ دیکھے بغیر کہ اس وقت یہ اس کے آرام کا وقت ہوگا یا نماز کا وقت ہوگا یا دوسری ضروریات کا وقت ہوگا۔

یہ بے چارہ ''مولوی'' تو ساری دنیا کی میراث ہے، اس سے ملاقات اور اس سے بات کرنے کے لیے کسی قاعدے اور قانون کی ضرورت نہیں، چنانچہ میرے پاس تو رات کے دو بجے ٹیلی فون آجاتا ہے، ایک مرتبہ رات کے دو بجے فون آیا، میں نے پوچھا کہ فون کرنے سے پہلے گھڑی میں ٹائم دیکھا تھا، اس وقت کیا ٹائم ہو رہا ہے؟ جواب دیا کہ ہاں دیکھا تو تھا، لیکن یہی خیال تھا کہ شاید آپ اس وقت تہجد کے لیے اٹھے ہوں گے، لہٰذا اس وقت آپ کو فون کرلیں۔ اب دو بجے رات کو فون کر رہے ہیں اور مسئلہ بھی کوئی ایسا نہیں تھا جس کی فوری ضرورت ہو، بلکہ عام مسئلہ کے لیے رات کو دو بجے فون کر رہے ہیں۔

آج اس بات کا خیال بھی دل سے اٹھ گیا کہ اگر کسی کو فون کریں تو ایسے وقت میں کریں کہ جس سے سامنے والے کو تکلیف نہ ہو۔

لمبی بات کرنے سے پہلے اجازت لے لو

بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ فون کی گھنٹی بجی اور آپ نے ریسیور اٹھالیا، لیکن آپ جلدی میں ہیں اور آپ کو فوراً کہیں جانا ہے، مثلاً آپ کے جہاز کا وقت ہے یا دفتر میں پہنچنا ہے یا بیت الخلاء کا تقاضا ہے، اب سامنے والے نے فون پر لمبی بات شروع کردی۔ اس لیے معارف القرآن میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اگر کسی سے فون پر لمبی بات کرنی ہو تو پہلے پوچھ لو کہ میں ذرا لمبی بات کرنا چاہتا ہوں، اگر اس وقت فارغ ہوں تو ابھی کرلوں یا دوسرا وقت بتادیں، میں اس وقت فون کرلوں گا، تاکہ اس کو تکلیف نہ ہو۔ یہ سارے آداب بھی دین کا حصہ ہیں، اسلام نے ان کی تعلیم دی ہے، لیکن ہم نے دین اسلام کو چند عبادتوں میں محدود کردیا ہے اور معاشرت کے یہ احکام جو قرآن وحدیث میں بھرے ہوئے ہیں، ان کو دین سے خارج کردیا ہے، اس کے نتیجے میں ہماری زندگیوں میں ایک عجیب قسم کی بے چینی پیدا ہوگئی ہے۔ سورۃ الحجرات کی یہ آیت ان تمام آداب کی طرف اشارہ کررہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی فہم عطا فرمائے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین
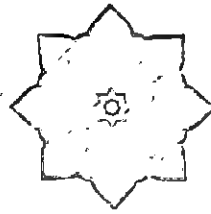
خدمت کے آداب

(انعام الباری ۲/۲۴۹)
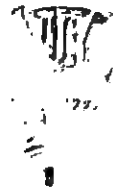
بسم اللہ الرحمن الرحیم

خدمت کے آداب

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّیْ وَنُسَلِّمُ عَلٰی رَسُوْلِهِ الْکَرِیْمِ اما بعد!

عن ابن عباس ﷺ أن النبی ﷺ دخل الخلاء فوضعت له وضوءًا، قال: من وضع هذا، فأخبر، فقال: "اللّٰهم فقهه فی الدین"(۱)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خلا میں داخل ہوئے تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وضو کا پانی بھر کر رکھ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھرے بھرائے لوٹے سے آرام محسوس کرنے کے بعد پوچھا کہ یہ کس نے رکھا ہے؟ بتایا گیا کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے رکھا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے اللہ! ان کو دین میں تفقہ اور سمجھ عطا فرما۔''

---

(۱) صحیح البخاری ۴۱/۱ (۱۴۳)۔

افضل خدمت

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اپنے کسی بڑے کی ایسی خدمت کردینا جس کا اس نے حکم نہیں دیا، لیکن یقین ہے کہ وہ اس کے لیے راحت کا سبب ہوگا، فضیلت کی بات ہے۔

ایک تو وہ خدمت ہے جو مخدوم کے کہنے سے کی جائے، اس نے کہا کہ میرا یہ کام کردو، خادم نے کردیا۔ اس میں بھی بڑی فضیلت ہے، لیکن کوئی ایسی خدمت کرنا، جس کا اس نے کہا نہیں تھا خود سے یہ خیال آیا کہ میں یہ کام کردوں جس سے اسے راحت ملے گی جس کی پہلے سے اس کو توقع نہیں تھی۔

ایک وہ راحت ہے جس کی پہلے سے توقع ہو اس سے بھی خوشی حاصل ہوتی ہے، لیکن ایک وہ راحت ہے جس کی پہلے توقع نہ ہو، اس سے زیادہ خوشی حاصل ہوتی ہے، زیادہ آرام ملتا ہے۔ تو خادم اگر مخدوم کا ایسا کام کردے جو اس کی توقع سے زیادہ ہو تو اس کو زیادہ خوشی اور راحت ملے گی اور خادم کو اجر و ثواب اور فضیلت بھی حاصل ہوگی۔

لیکن یہ اسی وقت ہے، جب یقین ہو کہ میری اس خدمت سے مخدوم کو راحت ملے گی اور یہ جاننے کے لیے فہمِ سلیم کی ضرورت ہے، یہ نہیں کہ اپنی طرف سے ایسی خدمت کردی جس سے الٹی تکلیف پہنچ گئی، حالانکہ راحت پہنچانے کا ارادہ تھا، تو ایسی صورت میں جب کہ تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو، خدمت نہ کرنا بہتر ہے۔

خدمت کے لیے عقل کی ضرورت ہے

ایک مرتبہ ہم مسجد میں گئے اور جوتے باہر چھوڑ گئے، نماز پڑھ کر باہر آئے تو دیکھا کہ جوتے غائب ہیں۔ ساتھی تلاش کرنے لگے کوئی ادھر دوڑ رہا ہے کوئی اُدھر دوڑ رہا ہے، میں سمجھا کوئی بے چارہ اٹھا کر مسجد میں لے گیا ہوگا، ایسے واقعات پیش آتے ہی رہتے ہیں، جب پانچ سات منٹ ہوگئے تو ایک صاحب اندر سے ٹہلتے ہوئے تشریف لائے اور کہا کہ جی باہر رکھے ہوئے تھے میں نے اس خیال سے اٹھا کر اندر رکھ دیے کہ چوری نہ ہوجائیں۔

اب اس بے چارے نے اپنی دانست میں تو بھلائی کی کہ چوری سے بچانے کے لیے اندر جا کر رکھ دیے، لیکن بے چارہ عقل سے پیدل تھا، اس واسطے اس نے یہ کام کر دیا اور بتایا نہیں کہ کہاں رکھے ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ بجائے فائدہ پہنچنے کے نقصان پہنچ گیا۔ تو خدمت کے لیے بھی عقل اور سمجھ چاہیے، بغیر فہم وعقل کے جو خدمت کی جائے گی وہ فائدے کے بجائے نقصان کا سبب بن جاتی ہے۔ ایک تو یہ بات معلوم ہوئی۔

مخدوم کی ذمہ داری

دوسری بات یہ ہے کہ جب کسی مخدوم کو ایسے کسی خادم سے کوئی راحت پہنچے تو اس مخدوم کے لیے سنّت یہ ہے کہ خادم کے حق میں دعا کرلے، یعنی اس کی خدمت کا حق یہ ہے کہ اس کو تھوڑا سا خوش کیا جائے، خوش کرنے کا ایک طریقہ یہ ہوگا کہ محض تعریف کردے کہ بڑا اچھا کام کیا، اس سے بھی آدمی خوش ہوجاتا ہے، اس کی حوصلہ افزائی ہوجاتی ہے، لیکن اس سے صرف اتنا ہی فائدہ حاصل ہوا کہ سن کر تھوڑا سا دل خوش ہوگیا۔

لیکن اگر اس کے حق میں دعا کر دیں تو یہ ایسی چیز ہے جو دنیا و آخرت میں اس کے لیے نافع ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہاں دعا دی اور دعا بھی ایسی کہ جو چیز ''تفقہ فی الدین'' سالہا سال کی مشقت سے بھی مشکل سے حاصل ہوتی ہے اس کی دعا فرمادی اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے بڑی نعمت اور کیا ہے؟

اس واسطے معلوم ہوا کہ مخدوم خدمت لے کر خاموش نہ بیٹھا رہے، بلکہ اس کا کام ہے کہ خادم کو دعا دے، کم از کم ''جزاك الله'' ہی کہہ دے تاکہ اللہ ﷻ اس کو دنیا و آخرت میں اس کا بدلہ عطا فرمائیں۔

پیر صاحبان تو خدمت کو اپنا حق سمجھتے ہیں، یہ سمجھے ہوئے ہوتے ہیں کہ اگر کوئی خادم خدمت کر رہا ہے تو وہ ہمارا قرضہ چکا رہا ہے، لہٰذا نہ شکریہ ادا کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہمت افزائی کی حاجت ہے، بلکہ الٹا ڈانٹ پھٹکار ہی چلتی رہتی ہے، تو یہ طریقہ سنّت کے مطابق نہیں ہے، سنّت یہ ہے کہ اپنے خادم کی حوصلہ افزائی کرے اور یہ حوصلہ افزائی دعا کے ذریعے کرے، کیونکہ یہ خدمت کو اپنا حق سمجھ رہا ہے تاکہ حق ہونے کی بات اس کے ذہن سے نکل جائے، اس لیے کہ دعا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ میرا حق نہیں ہے۔ اللہ جل جلالہ ہی آپ کو اس کا بدلہ دیں۔

افراط و تفریط نہ ہونا چاہیے

یہ باتیں اس لیے ذکر کر رہا ہوں کہ ان میں بڑی افراط و تفریط ہوتی رہتی ہے، ابھی تو آپ یہاں طالب علم ہیں، خادم بن کر رہتے ہیں، لیکن جب استاذ بن کر جائیں گے تو پھر دماغ میں تھوڑا سا ''خناس'' آجائے گا کہ میں محتاج الیہ

ہوں اور جو سامنے بیٹھے ہیں وہ محتاج ہیں، لہٰذا یہ خادم ہیں اور میں مخدوم ہوں، تو شاگردوں کے ساتھ معاملہ کبھی کبھار تکبر کی حدود میں آجاتا ہے اور بعض اوقات دل شکنی کی صورت میں آجاتا ہے، طالب علم بے چارہ کہے یا نہ کہے۔

اور اگر خدانخواستہ پیر بن گئے تو اللہ اکبر، پھر تو چھوٹی سی خدائی ہے، جتنے مریدین ہیں، بے چارے سب بندے بن گئے۔ اللہ بچائے۔ پھر اس کی کھال اور چمڑی بھی حلال، ان کا مال اور آبرو بھی حلال۔ تو یہ سب باتیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کو نہ سمجھنے اور عمل نہ کرنے کی وجہ سے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان سنتوں کو سمجھ کر ان پر عمل کرنے والا بنائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین
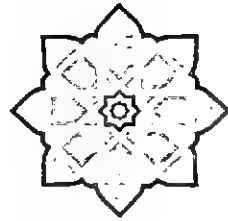
بڑوں کی اطاعت

اور

ادب کے تقاضے

(اصلاحی خطبات ۳/۲۲۲)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بڑوں کی اطاعت
اور
ادب کے تقاضے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ اَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ أَمَّا بَعْدُ!

عن أبی العباس سهل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ أن رسول الله ﷺ بَلَغَه ان بنی عمرو بن عوف كان بينهم شر فخرج رسول الله ﷺ يصلح بينهم فی

اناس معه فحبس رسول الله ﷺ وحانت الصلاة[1]

"باب الاصلاح بین الناس" لوگوں کے درمیان صلح کرنے کا بیان چل رہا ہے، اس باب کی تین حدیثیں پیچھے گزر چکی ہیں اور یہ اس باب کی آخری حدیث ہے جو ذرا طویل ہے، اس لیے اس کا ترجمہ اور تشریح عرض کیے دیتا ہوں۔

لوگوں کے درمیان صلح کرانا

حضرت سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ملی کہ قبیلہ بنی عمرو بن عوف کے درمیان آپس میں جھگڑا کھڑا ہوگیا ہے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے درمیان مصالحت کرانے کے لیے تشریف لے گئے اور بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساتھ لے لیا، تاکہ اس مصالحت میں وہ مدد دیں۔ مصالحت کرانے کے دوران بات لمبی ہوگئی اور اتنی دیر ہوگئی کہ نماز کا وقت آگیا، یعنی وہ وقت آگیا جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں نماز پڑھایا کرتے تھے، لیکن چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی تک فارغ نہیں ہوئے تھے اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں تشریف نہ لا سکے۔

یہاں اس حدیث کو لانے کا منشاء یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے درمیان جھگڑے کو ختم کرانے اور مصالحت کرانے کو اتنی اہمیت دی اور اس میں اتنے مصروف ہوئے کہ نماز کا مقررہ وقت آگیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں تشریف نہ لا سکے۔

---

(۱) صحیح البخاری ۶۶/۲ (۱۲۱۸) وصحیح مسلم ۳۱۶/۱ (۴۲۱) مذکور الصدر الفاظ امام نووی کی کتاب ریاض الصالحین ۱۱۲ (۲۵۱) کے ہیں۔ از مرتب

راوی فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے موذن حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے جب یہ دیکھا کہ نماز کا وقت ہوگیا ہے اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف نہیں لائے تو وہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور ان سے جا کر عرض کیا کہ جناب ابوبکر صدیق! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیر ہوگئی ہے اور نماز کا وقت آگیا ہے، ہوسکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مزید کچھ دیر ہوجائے اور لوگ نماز کے انتظار میں رہیں، کیا یہ ہوسکتا ہے کہ آپ امامت کرادیں؟ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اگر تم چاہو تو ایسا کرسکتے ہیں، ہم نماز پڑھ لیتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیر ہوگئی ہوگی۔ اس کے بعد حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے تکبیر کہی اور حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ امامت کے لیے آگے بڑھ گئے، حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے نماز کے لیے اللہ اکبر کہا اور لوگوں نے تکبیر کہی، جب نماز شروع کردی تو نماز کے دوران حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور صف میں ایک جگہ پر مقتدی کی حیثیت سے کھڑے ہوگئے۔

جب لوگوں نے دیکھا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے ہیں اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے کے بارے میں پتہ نہیں ہے، اس لیے کہ وہ آگے امامت کر رہے ہیں، تو لوگوں کو خیال ہوا کہ اب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو علم ہوجانا چاہیے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا چکے ہیں، تاکہ وہ پیچھے ہٹ جائیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آگے ہوکر نماز پڑھائیں اور چونکہ اس وقت لوگوں کو مسئلہ معلوم نہیں تھا، اس لیے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اطلاع دینے کے لیے نماز کے اندر تالیاں بجانا شروع کردیں اور ان کو متنبہ کرنا شروع کیا، لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا حال یہ تھا کہ جب نماز شروع کردیتے تو ان کو دنیا و

مالیہا کی کچھ خبر نہیں رہتی تھی اور وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے تھے کہ دائیں بائیں کیا ہو رہا ہے۔ اس لیے شروع میں جب ایک دو آدمیوں نے تالی بجائی تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو پتہ بھی نہیں چلا۔ وہ اپنی نماز میں مصروف رہے، لیکن جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ دیکھا کہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کچھ التفات نہیں فرما رہے ہیں تو اس وقت لوگوں نے زیادہ زور سے تالی بجانی شروع کردی اور جب کئی صحابہ رضی اللہ عنہم نے تالی بجائی اور آواز بلند ہونے لگی تو اس وقت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو کچھ شبہ ہوا اور کن انکھیوں سے دائیں بائیں دیکھنا شروع کیا تو اچانک دیکھا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم صف میں تشریف فرما ہیں! حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو صف میں دیکھ کر حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے پیچھے ہٹنا چاہا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ہاتھ کے اشارے سے منع فرمایا کہ تم اپنی جگہ رہو، پیچھے ہٹنے کی ضرورت نہیں، نماز پوری کرلو۔

لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیا تو پھر ان کے بس میں نہ رہا کہ وہ اپنے مصلے پر کھڑے رہتے، اس لیے اُلٹے پاؤں پیچھے کی طرف ہٹنا شروع کردیا۔ یہاں تک کہ صف میں آکر کھڑے ہوگئے اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم آگے مصلے پر تشریف لے گئے اور پھر باقی نماز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھائی۔

امام کو متنبہ کرنے کا طریقہ

جب نماز ختم ہوگئی تو اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور خطاب فرمایا کہ یہ کیا طریقہ ہے کہ اگر نماز کے اندر کوئی واقعہ پیش آجائے تو

تم تالیاں بجانا شروع کر دیتے ہو، یہ طریقہ نماز کے شایانِ شان اور مناسب نہیں اور تالیاں بجانا تو عورتوں کے لیے مشروع ہے، یعنی بالفرض اگر خواتین کی جماعت ہو رہی ہو۔ ویسے خواتین کی جماعت اچھی اور پسندیدہ نہیں ہے یا خواتین نماز میں شامل ہوں اور وہ امام کو کسی بات کی طرف متوجہ کرنا چاہیں۔ تو ان کے لیے یہ حکم ہے کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر تالیاں بجائیں ان کے لیے نماز کے اندر زبان سے ''سبحان اللہ'' یا ''الحمد للہ'' کہنا اچھا نہیں ہے، کیونکہ اس طرح خاتون کی آواز مردوں کے کان میں جائے گی اور خاتون کی آواز کا بھی شریعت میں پردہ ہے، لہٰذا ان کے لیے حکم یہ ہے کہ اگر نماز کے اندر کوئی واقعہ پیش آجائے جس کی وجہ سے امام کو کسی بات کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہو، تو اس میں مردوں کے لیے طریقہ یہ ہے کہ وہ سبحان اللہ کہیں، مثلاً امام کو بیٹھنا چاہیے تھا اور مقتدیوں نے دیکھا کہ کھڑا ہو رہا ہے تو مقتدی کو چاہیے کہ وہ سبحان اللہ یا الحمد للہ کہیں یا امام کو کھڑا ہونا چاہیے تھا، لیکن وہ بیٹھ گیا تو اس وقت بھی سبحان اللہ کہہ دیں یا بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جہری نماز ہے اور امام نے سرّاً قرآت شروع کر دی، تو اس وقت بھی اس کو الحمد للہ وغیرہ سے متنبہ کر دے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر نماز میں کوئی بھی ایسا عمل پیش آجائے، جس کی وجہ سے اس کو تنبیہ کرنا مقصود ہو تو مقتدی ''سبحان اللہ'' کہہ دیں، تالیاں نہیں بجانی چاہیے۔

ابو قحافہ کے بیٹے کی یہ مجال نہیں تھی

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے فرمایا کہ اے ابو بکر! میں نے تو آپ کو اشارہ کر دیا تھا کہ آپ اپنی

نماز جاری رکھیں اور پیچھے نہ ہٹیں، اس کے بعد پھر کیا وجہ ہوئی آپ پیچھے ہٹ گئے اور امامت کرنے سے آپ نے تردد کیا۔ اس وقت حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کیا عجیب جواب دیا، فرمایا کہ

”مَاكَانَ لِابْنِ اَبِیْ قُحَافَةَ أَنْ يُصَلِّيَ بِالنَّاسِ بَيْنَ يَدَیْ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ“

یا رسول اللہ! ابو قحافہ کے بیٹے کی یہ مجال نہیں تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں لوگوں کی امامت کرے۔ ابو قحافہ ان کے والد کا نام ہے، یعنی میری یہ مجال نہیں تھی کہ آپ کی موجودگی میں مصلّٰی پر کھڑا ہو کر امامت کرتا رہوں، جب تک آپ ﷺ تشریف نہیں لائے تھے تو بات دوسری تھی، جب آپ ﷺ کو دیکھ لیا تو میرے اندر یہ تاب نہیں تھی کہ میں امامت جاری رکھوں، اس واسطے میں پیچھے ہٹ گیا۔ آنحضرت نے اس پر کوئی اعتراض نہیں فرمایا، بلکہ خاموشی اختیار فرمائی۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مقام

اس سے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مقام معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں حضورِ اقدس ﷺ کی عظمت اس درجہ پیوست کر رکھی تھی کہ فرماتے ہیں کہ یہ بات میری برداشت سے باہر تھی کہ حضور اکرم ﷺ کھڑے ہوں اور میں آگے رہوں، اگرچہ یہ واقعہ حضور اکرم ﷺ کی غیر موجودگی میں پیش آیا اور وہ حضور اکرم ﷺ کی موجودگی میں کھڑے نہیں ہوئے تھے، لیکن جب پتہ لگ گیا کہ حضور اکرم ﷺ پیچھے ہیں تو پھر آگے کھڑا رہنا برداشت سے باہر تھا اس لیے پیچھے ہٹ گئے۔

الامر فوق الادب

یہاں ایک مسئلہ اور ادب عرض کردوں جو مسنون ادب ہے، آپ نے وہ مشہور مقولہ سنا ہوگا کہ

"الأمر فوق الأدب"

یعنی تعظیم کا تقاضہ یہ ہے کہ جب کوئی بڑا کسی بات کا حکم دے، چاہے اس بات پر عمل کرنا ادب کے خلاف معلوم ہو رہا ہو اور ادب کا تقاضہ یہ ہو کہ وہ عمل نہ کیا جائے، لیکن جب بڑے نے حکم دے دیا تو چھوٹے کا کام یہ ہے کہ اس حکم کی تعمیل کرے، یہ بڑی نازک بات ہے اور بعض اوقات اس پر عمل بھی مشکل ہوتا ہے، لیکن دین پر عمل کرنے والے تمام بزرگوں کا ہمیشہ یہی معمول رہا ہے کہ جب کسی بڑے نے کسی کام کا حکم دیا تو ادب کے بجائے حکم کی تعمیل کو مقدم رکھا۔

بڑے کے حکم پر عمل کرے

مثلاً: فرض کرو کہ ایک بڑا بزرگ شخص ہے، وہ کسی امتیازی جگہ جیسے تخت وغیرہ پر بیٹھا ہے، اب ایک شخص اس کے پاس آیا جو اس سے چھوٹا ہے، ان بزرگ نے کہا کہ بھائی! تم یہاں میرے پاس آجاؤ۔ تو اس وقت اس کی بات مان لینی چاہیے، اگرچہ ادب کا تقاضہ یہ ہے کہ پاس نہ بیٹھے، دور ہوکر بیٹھے، اس کے پاس تخت پر جا کر بیٹھ جانا ادب کے خلاف ہے، لیکن جب بڑے نے حکم دے کر کہہ دیا کہ یہاں آجاؤ تو اس وقت تعظیم کا تقاضہ یہی ہے کہ اس کے حکم پر عمل کرے، چاہے دل میں یہ بات بری لگ رہی ہو کہ میں بڑے کے بالکل قریب بیٹھ جاؤں۔ اس لیے کہ ادب کے مقابلے میں حکم کی تعمیل زیادہ مقدم ہے۔

دین کا خلاصہ ''اتباع'' ہے

میں بار بار عرض کرچکا ہوں کہ سارے دین کا خلاصہ ہے اتباع، بڑے کے حکم کو ماننا، اس کے آگے سر تسلیم خم کردینا، اللہ کے حکم کی اتباع، اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کی اتباع، اللہ کے رسول ﷺ کے وارثین کی اتباع، بس وہ جو کہہ رہے ہیں اس پر عمل کرو، چاہے ظاہر میں وہ بات تمہیں ادب کے خلاف معلوم ہو۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں میری حاضری

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس اتوار کے دن ہوا کرتی تھی۔ اس لیے کہ اس زمانے میں اتوار کی سرکاری چھٹی ہوا کرتی تھی، یہ آخری مجلس کا واقعہ ہے، اس کے بعد حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کوئی مجلس نہیں ہوئی، بلکہ اگلی مجلس کا دن آنے سے پہلے ہی والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوگیا، چونکہ والد صاحب بیمار اور صاحبِ فراش تھے، اس لیے آپ کے کمرے میں ہی لوگ جمع ہوجایا کرتے تھے، والد صاحب چارپائی پر ہوتے، لوگ سامنے نیچے اور صوفوں پر بیٹھ جایا کرتے تھے، اس روز لوگ بہت زیادہ آئے اور کمرہ پورا بھر گیا حتیٰ کہ کچھ لوگ کھڑے بھی ہوگئے اور مجھے حاضری میں تاخیر ہوئی۔ میں ذرا دیر سے پہنچا، حضرت والد صاحب رحمہ اللہ نے جب مجھے دیکھا تو فرمایا: تم یہاں میرے پاس آجاؤ، میں ذرا جھجکنے لگا کہ لوگوں کو پھلانگتا ہوا اور چیرتا ہوا جاؤں گا اور حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جاکر بیٹھوں گا، اگرچہ یہ بات ذہن میں مستحضر تھی کہ جب بڑا کوئی بات کہے تو مان لینی چاہیے، لیکن میں ذرا ہچکچا رہا تھا، حضرت والد

صاحب رحمہ اللہ نے جب میری ہچکچاہٹ دیکھی تو دوبارہ فرمایا: تم یہاں آجاؤ تو تمہیں ایک قصہ سناؤں۔ خیر میں کسی طرح وہاں پہنچ گیا اور حضرت والد صاحب کے پاس بیٹھ گیا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں والد صاحب کی حاضری

والد صاحب فرمانے لگے کہ ایک مرتبہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی مجلس ہو رہی تھی اور وہاں اسی طرح کا قصہ پیش آیا کہ جگہ تنگ ہوگئی اور بھر گئی اور میں ذرا تاخیر سے پہنچا تو حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کہ تم یہاں میرے پاس آجاؤ، میں کچھ جھجکنے لگا کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بالکل پاس جاکر بیٹھ جاؤں تو حضرت والاؒ نے دوبارہ فرمایا کہ تم یہاں آجاؤ، پھر میں تمہیں ایک قصہ سناؤں گا۔ حضرت والد صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ پھر میں کسی طرح پہنچ گیا اور حضرت والاؒ کے پاس جاکر بیٹھ گیا، تو حضرتِ والا رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قصہ سنایا۔

عالمگیر اور داراشکوہ کے درمیان تخت نشینی کا فیصلہ

قصہ سنایا کہ مغل بادشاہ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے والد کے انتقال کے بعد باپ کی جانشینی کا مسئلہ کھڑا ہوگیا اور یہ دو بھائی تھے۔ ایک عالمگیر اور دوسرے داراشکوہ، آپس میں رقابت تھی۔ عالمگیر بھی اپنے باپ کے جانشین اور بادشاہ بننا چاہتے تھے اور ان کے بھائی داراشکوہ بھی تخت کے طالب تھے۔ ان کے زمانے میں ایک بزرگ تھے، دونوں نے ارادہ کیا کہ ان بزرگ سے جاکر اپنے حق میں دعا کرائی جائے۔ پہلے داراشکوہ ان بزرگ کے پاس زیارت اور دعا کے لیے پہنچے، اس وقت وہ بزرگ تخت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان بزرگ نے داراشکوہ سے کہا

کہ یہاں میرے پاس آجاؤ اور تخت پر بیٹھ جاؤ، دارا شکوہ نے کہا کہ نہیں حضرت، میری مجال نہیں ہے کہ میں آپ کے پاس تخت پر بیٹھ جاؤں، میں تو یہاں نیچے ہی ٹھیک ہوں، ان بزرگ نے پھر کہا کہ میں تمہیں بلا رہا ہوں، یہاں آجاؤ، لیکن وہ نہیں مانے اور ان کے پاس نہ گئے، وہیں بیٹھے رہے، ان بزرگ نے فرمایا کہ اچھا تمہاری مرضی، پھر ان بزرگ نے ان کو جو نصیحت فرمانی تھی وہ فرمادی اور وہ واپس چلے گئے۔

ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ آگئے، جب وہ سامنے نیچے بیٹھنے لگے تو ان بزرگ نے فرمایا کہ کہ تم یہاں میرے پاس آجاؤ، وہ فوراً جلدی سے اٹھے اور ان بزرگ کے پاس جا کر تخت پر بیٹھ گئے پھر ان کو جو نصیحت فرمانی تھی وہ فرمادی جب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ واپس چلے گئے تو ان بزرگ نے اپنی مجلس کے لوگوں سے فرمایا کہ ان دونوں بھائیوں نے تو خود ہی اپنا فیصلہ کرلیا۔ دارا شکوہ کو ہم نے تخت پیش کیا۔ اس نے انکار کردیا۔ اور عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کو پیش کیا تو انہوں نے لے لیا، اس واسطے دونوں کا فیصلہ ہوگیا۔ اب تخت شاہی عالمگیر کو ملے گا چنانچہ ان کو ہی مل گیا۔

یہ واقعہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے حضرت والد رحمہ اللہ کو سنایا۔

حیل و حجت نہ کرنا چاہیے

یہ تو ایک تاریخی واقعہ ہے۔ بہرحال! ادب یہ ہے کہ جب بڑا کہہ رہا ہے کہ یہ کام کرلو، تو اس میں زیادہ حیل و حجت کرنا ٹھیک بات نہیں، اس وقت تعظیم کا تقاضہ یہ ہے کہ جا کر بیٹھ جائے، اس لیے کہ بڑے کے حکم کی تعمیل ادب پر مقدم ہے۔

بزرگوں کے جوتے اٹھانا

بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ لوگ کسی بزرگ کے جوتے اٹھانا چاہتے ہیں۔ اب اگر وہ بزرگ زیادہ اصرار کے ساتھ یہ کہیں کہ مجھے یہ پسند نہیں تو اس صورت میں بھی تعظیم کا تقاضہ یہ ہے کہ چھوڑ دے اور جوتے نہ اٹھائے۔ بعض اوقات لوگ اس میں چھینا جھپٹی شروع کردیتے ہیں اور برسرِپیکار ہوجاتے ہیں، یہ تعظیم کے خلاف ہے۔ اس لیے یہ مقولہ مشہور ہے کہ

"الأمر فوق الأدب"

حکم کی تعمیل ادب کے تقاضے پر مقدم ہے بڑا جو کہے اس کو مان لو، ہاں! ایک دو مرتبہ بزرگ سے یہ کہہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ حضرت! مجھے اس خدمت کا موقع دیجیے، لیکن جب بڑے نے حکم ہی دے دیا تو اس صورت میں حکم کی تعمیل ہی واجب ہے، وہی کرنا چاہیے، عام حالات کا دستور یہی ہے جس کام کا حکم دیا جائے اس کے مطابق عمل کیا جائے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معمول بھی یہی ہے۔

صحابہ کرام کے دو واقعات

البتہ اس واقعے میں جو آپ نے دیکھا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم اپنی جگہ پر کھڑے رہو، لیکن صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ پیچھے ہٹ گئے اور ادب کے تقاضے پر عمل کیا اور حکم نہیں مانا تو اس قسم کے واقعات پورے عہدِ صحابہ میں صرف دو ملتے ہیں کہ جن میں

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا، لیکن صحابہ نے ادب کے تقاضے کو حکم کی تعمیل پر مقدم رکھا، ایک تو یہی واقعہ ہے اور ایک واقعہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہے۔

خدا کی قسم! میں نہیں مٹاؤں گا

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور کفارِ مکہ کے درمیان صلح نامہ لکھا جارہا تھا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلایا کہ تم لکھو۔ انہوں نے فرمایا کہ ٹھیک ہے جب معاہدے کی شرائط لکھنی شروع کیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صلح نامہ پر لکھا "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" تو جو شخص کفار کی طرف سے صلح کی شرائط طے کرنے آیا تھا اس نے کہا ہم تو "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" نہیں لکھنے دیں گے اور چوں کہ یہ صلح نامہ دونوں کی طرف سے ہوگا اس لیے اس میں ایسی بات ہونی چاہیے جس پر دونوں متفق ہوں۔ ہم "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" سے اپنے کام کا آغاز نہیں کرتے، ہم تو "باسمك اللهم" لکھتے ہیں۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی لوگ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" کے بجائے "باسمك اللهم" یعنی اے اللہ! آپ کے نام سے ہم شروع کرتے ہیں۔ لکھتے تھے۔ اس لیے اس نے کہا کہ اس کو مٹادیں اور باسمك اللهم لکھیں۔ تو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ہمارے لیے اس میں کیا فرق پڑتا ہے، "باسمك اللهم" بھی اللہ تعالیٰ کا نام ہے چلو وہ مٹادو اور یہ لکھ دو، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے "باسمك اللهم" لکھ دیا۔

اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ لکھنا شروع کیا کہ یہ معاہدہ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سرداران مکہ کے درمیان طے پایا۔ کفار کی طرف سے جو نمائندہ

تھا، اس نے پھر اعتراض کیا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ''محمدؐ'' کے ساتھ ''رسول اللہ'' کیسے لکھ دیا؟ اگر ہم آپ کو'' رسول اللہ'' مان لیں تو پھر جھگڑا ہی کیسا؟ سارا جھگڑا تو اس بات پر ہے کہ ہم آپ کو رسول اللہ تسلیم نہیں کرتے، لہٰذا یہ معاہدہ جس پر آپ نے'' محمدؐ'' کے ساتھ'' رسول اللہ'' بھی لکھا ہے۔ ہم اس پر دستخط نہیں کریں گے۔ آپ صرف یہ لکھیں کہ'' یہ معاہدہ محمد بن عبد اللہ اور سرداران قریش کے درمیان طے پایا۔'' تو پھر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: چلو کوئی بات نہیں، تم تو مجھے اللہ کا رسول مانتے ہو اس لیے'' محمدؐ'' کے ساتھ رسول اللہ کا لفظ مٹادو اور'' محمد بن عبد اللہ'' لکھ دو۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے پہلی بات تو مان لی تھی اور'' بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' کے بجائے'' باسمك اللهم '' لکھ دیا تھا، لیکن جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ'' محمد رسول اللہ'' کاٹ کر'' محمد بن عبد اللہ'' لکھ دو تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فوراً بے ساختہ فرمایا کہ'' واللہ لا امحوہ'''' خدا کی قسم میں لفظ'' رسول اللہ'' کو نہیں مٹاؤں گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مٹانے سے انکار کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے جذبات کو محسوس فرمایا اور فرمایا: اچھا تم نہ مٹاؤ مجھے دو میں اپنے ہاتھ سے مٹاؤں گا، چنانچہ وہ عہد نامہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے لے کر اپنے دستِ مبارک سے'' رسول اللہ'' کا لفظ مٹا دیا۔[1]

اگر حکم کی تعمیل اختیار سے باہر ہو جائے

یہاں بھی یہی واقعہ ہوا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جو حکم

(۱) صحیح البخاری ۳/۱۸۴ (۲۶۹۸-۲۶۹۹) وصحیح مسلم ۳/۱۴۰۹ (۱۷۸۳)

دیا تھا انہوں نے اس کی تعمیل سے انکار فرمایا اور بظاہر یوں لگتا ہے کہ ادب کو حکم پر مقدم کرلیا۔ حالانکہ حکم ادب پر مقدم ہے اس کی حقیقت سمجھ لیجیے کہ اصل قاعدہ تو وہی ہے کہ بڑا جو کہہ رہا ہے اس کو مانے اور اس کی تعمیل کرے، لیکن بعض اوقات انسان کسی حالت سے اتنا مغلوب ہوجاتا ہے کہ اس کے لیے حکم کی تعمیل کرنا اختیار سے باہر ہوجاتا ہے۔ گویا کہ اس کے اندر اس کام کی استطاعت اور طاقت ہی نہیں ہوتی۔ اس وقت اگر وہ اس کام سے پیچھے ہٹ جائے تو اس پر یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس نے نافرمانی کی، بلکہ اس پر یہ حکم صادق آئے گا کہ "لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا"[1] یعنی اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ مکلف نہیں کرتے۔ تو پہلے واقعہ میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے تو خود ہی فرمادیا کہ یہ بات میرے بس سے باہر تھی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں موجود ہوں اور ابو قحافہ کا بیٹا امامت کرتا رہے اور دوسرے واقعہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اتنے مغلوب الحال تھے کہ یہ بات ان کے بس سے باہر تھی کہ وہ "محمد" کے نام سے "رسول اللہ" کا لفظ مٹادیں، بس اس واسطے انہوں نے مٹانے سے انکار کردیا۔

یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

لیکن اصل حکم وہی ہے کہ محبوب جو بات کہے اس کو مانو، اپنی نہ چلاؤ وہ جس طرح کہہ دے اسی کے مطابق عمل کرو۔

(۱) سورۃ البقرۃ آیت (۲۸۶)

نہ ہی ہجر اچھا نہ ہی وصال اچھا ہے
یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

عشق تسلیم و رضا کے ما سوا کچھ بھی نہیں
وہ وفا سے خوش نہ ہوں تو پھر وہ وفا کچھ بھی نہیں

اگر ان کی خوشی اس میں ہے کہ میں ایسا کام کروں جو بظاہر ادب کے خلاف لگ رہا ہے تو پھر وہی کام بہتر ہے جس کے اندر اس کی خوشی ہے اور ان کی رضا ہے۔

خلاصہ

بہر حال! امام نووی رحمۃ اللہ علیہ جو یہاں یہ حدیث لائے ہیں۔ وہ اس بات کی طرف اشارہ کرنے کے لائے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کے جھگڑے نمٹانے کی اور ان کے درمیان آپس میں صلح کرانے کی اتنی اہمیت تھی کہ نماز کا جو وقت مقرر تھا، اس سے آپ کو کچھ دیر بھی ہوگئی، لیکن آپ اس کے اندر مشغول رہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو آپس کے جھگڑوں سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

بڑے کا اکرام کیجیے

(اصلاحی خطبات: ۱۰/ ۲۲۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بڑے کا اکرام کیجیے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ اَنْ لَّا إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ أَمَّا بَعْدُ!

عن ابن عمر رضی اللہ عنہما قال: قال رسول الله ﷺ: «إذا أتاكم كريم قوم فأكرموه»[1]

(۱) سنن ابن ماجه ۲۸٤/٥ (۳۷۱۲) وأورده البوصيري في "مصباح الزجاجة" ۱۱۱/٤ وقال: هذا إسناد ضعيف، لضعف سعيد بن مسلمة. رواه الطبرانی فی الأوسط ۳٦۹/٥ (٥٥٨۲) والكبير ۳۰٤/۱۱ (۱۱۸۱۱) وقال الهيثمی فی "مجمع الزوائد" ۳٦/۸ (۱۲٦۲۳) وفی اسناد الكبير عيينة بن يقظان، وثقه ابن حبان وكذلك مالك بن الحسن بن مالك بن الحويرث وفيهما ضعف، وبقية رجال الكبير ثقة. (دار الفكر)

جب تمہارے پاس کسی قوم کا معزز مہمان آئے تو تم اس کا اکرام کرو۔

یعنی اگر کوئی شخص کسی قوم کا سردار ہے یا صاحبِ منصب ہے اور اس قوم کے اندر اس کو معزز سمجھا جاتا ہے، جب وہ تمہارے پاس آئے تو تم اس کا اکرام کرو۔

اکرام کا ایک انداز

ویسے تو شریعت میں ہر مسلمان کا اکرام کرنے کا حکم دیا گیا ہے، کوئی مسلمان بھائی تمہارے پاس آئے تو اس کا حق ہے کہ اس کا اکرام کیا جائے اور اس کی عزت کی جائے۔ حدیث شریف میں یہاں تک آیا ہے کہ اگر آپ کسی جگہ پر بیٹھے ہیں اور کوئی مسلمان تمہارے پاس ملنے آگیا تو کم از کم اتنا ضرور ہونا چاہیے کہ اس کے آنے پر تم تھوڑی سی حرکت کرلو[1]۔ یہ نہ ہو کہ ایک مسلمان بھائی تم سے ملنے کے لیے آیا، لیکن تم اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے، بلکہ بُت بنے بیٹھے رہے۔ یہ طریقہ اس کے اکرام کے خلاف ہے۔ لہٰذا کم از کم تھوڑی سی اپنی جگہ سے حرکت کرنی چاہیے تاکہ آنے والے کو یہ محسوس ہو کہ اس نے میرے آنے پر میری عزت کی ہے اور میرا اکرام کیا ہے۔

(۱) الزهد لهناد بن السری ۴۹۸/۲ طبع دار الخلفاء۔الکویت۔وشعب الایمان للبیهقی ۲۷۳/۱۱ (۸۵۳۴)۔ والمعجم الکبیر للطبرانی ۹۵/۲۲ (۲۲۸) وقال الهیثمي في "المجمع" ۸۱/۸ (۱۲۷۸۷): رواه الطبراني، ورجاله ثقات، إلا أن أبا عمیر عیسی بن محمد النحاس لم أجد له سماعا من أبي الأسود، والله أعلم.

اکرام کے لیے کھڑا ہوجانا

ایک طریقہ ہے دوسرے کے اکرام کے لیے کھڑا ہوجانا، مثلاً کوئی شخص آپ کے پاس آئے تو آپ اس کی عزت اور اکرام کے لیے اپنی جگہ سے کھڑے ہوجائیں۔ اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ جو شخص آنے والا ہے اگر وہ اس بات کی خواہش رکھتا ہے کہ لوگ میرے اکرام اور میری عزت کے لیے کھڑے ہوں، تو اس صورت میں کھڑا ہونا درست نہیں۔ اس لیے کہ یہ خواہش اس بات کی نشان دہی کر رہی ہے کہ اس کے اندر تکبر اور بڑائی ہے اور وہ دوسرے لوگوں کو حقیر سمجھتا ہے، اس لیے وہ یہ چاہتا ہے کہ دوسرے لوگ میرے لیے کھڑے ہوں۔ ایسے شخص کے بارے میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ اس کے لیے نہ کھڑے ہوں، لیکن اگر آنے والے شخص کے دل میں یہ خواہش نہیں ہے کہ لوگ میرے لیے کھڑے ہوں، اب آپ اس شخص کے علم یا اس کے تقویٰ یا اس کے منصب کی وجہ سے اس کا اکرام کرتے ہوئے اس کے لیے کھڑے ہوجائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، کوئی گناہ بھی نہیں اور کھڑا ہونا واجب بھی نہیں۔

حدیث سے کھڑے ہونے کا ثبوت

خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مواقع پر صحابہ کرام کو کھڑے ہونے کا حکم دیا، چنانچہ جب بنو قریظہ کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لیے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو آپ نے بلایا اور وہ تشریف لائے تو آپ نے اس وقت بنو قریظہ کے حضرات سے فرمایا:

"قوموا إلى سيدكم"[1]

(۱) صحیح البخاری ۶۷/۴ (۳۰۴۳) وصحیح مسلم ۱۳۸۸/۳ (۱۷۶۸)۔

یعنی تمہارے سردار آرہے ہیں، ان کے لیے تم کھڑے ہو جاؤ۔ لہٰذا ایسے موقع پر کھڑے ہونا جائز ہے، اگر کھڑے نہ ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن حدیث میں اس بات کی تاکید ضرور آئی ہے کہ کسی کے آنے پر یہ نہ ہو کہ آپ بت بنے بیٹھے رہیں اور اپنی جگہ پر حرکت بھی نہ کریں اور نہ اس کے آنے پر خوشی کا اظہار کریں، بلکہ آپ نے فرمایا کہ کم از کم اتنا تو کرلو کہ اپنی جگہ پر ذراسی حرکت کرلو، تاکہ آنے والے کو یہ احساس ہو کہ میرا اکرام کیا ہے۔

مسلمان کا اکرام ''ایمان'' کا اکرام ہے

ایک مسلمان کا اکرام اور اس کی عزت درحقیقت اس ''ایمان'' کا اکرام ہے جو اس مسلمان کے دل میں ہے۔ جب ایک مسلمان کلمہ طیبہ ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' پر ایمان رکھتا ہے اور وہ ایمان اس کے دل میں ہے، تو اس کا تقاضہ اور اس کا حق یہ ہے کہ اس مسلمان کا اکرام کیا جائے، اگرچہ ظاہری حالت کے اعتبار سے وہ مسلمان تمہیں کمزور نظر آرہا ہو اور اس کے اعمال اور اس کی ظاہری شکل وصورت پوری طرح دین کے مطابق نہ ہو، لیکن تمہیں کیا معلوم کہ اس کے دل میں جو ایمان اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے، اس ایمان کا کیا مقام ہے؟ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا ایمان کتنا مقبول ہے؟ محض ظاہری شکل وصورت سے اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ اس لیے ہر آنے والے مسلمان کا بحیثیت مسلمان ہونے کے اس کا اکرام کرنا چاہیے۔

ایک نوجوان کا سبق آموز واقعہ

ایک مرتبہ میں دارالعلوم میں اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا، اس وقت ایک

نوجوان میرے پاس آیا۔ اس نوجوان میں سر سے لے کر پاؤں تک ظاہری اعتبار سے اسلامی وضع قطع کی کوئی بات نظر نہیں آرہی تھی، مغربی لباس میں ملبوس تھا۔ اس کی ظاہری شکل دیکھ کر بالکل اس کا پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اس کے اندر بھی دینداری کی کوئی بات موجود ہوگی۔ میرے پاس آکر کہنے لگے کہ میں آپ سے ایک مسئلہ پوچھنے آیا ہوں۔ میں نے کہا کہ کیا مسئلہ ہے؟ وہ کہنے لگا کہ مسئلہ یہ ہے کہ میں ''اکچوری'' (Actuary) ''ماہر شماریات'' ہوں، (انشورنس کمپنیوں میں جو حسابات وغیرہ لگائے جاتے ہیں کہ کتنا ''پریمیم'' ہونا چاہیے اور انشورنس کی کتنی رقم ہونی چاہیے؟ اس قسم کے حسابات کے لیے ''اکچوری'' رکھا جاتا ہے۔ اس زمانے میں پاکستان بھر میں کہیں بھی یہ علم نہیں پڑھایا جاتا تھا، پھر اس نوجوان نے کہا کہ) میں نے یہ علم حاصل کرنے کے لیے ''انگلینڈ'' کا سفر کیا اور وہاں سے یہ حاصل کرکے آیا ہوں (اس وقت پورے پاکستان میں اس فن کو جاننے والے دو تین سے زیادہ نہیں تھے اور جو شخص ''ماہر شماریات'' بن جاتا ہے وہ انشورنس کمپنی کے علاوہ کسی اور جگہ پر کام کرنے کے قابل نہیں رہتا۔

بہرحال! اس نوجوان نے کہا کہ) اور میں نے یہاں آکر ایک انشورنس کمپنی میں ملازمت کرلی۔ اور چونکہ پاکستان بھر میں اس کے ماہر بہت کم تھے اس لیے ان کی مانگ بھی بہت تھی اور ان کی تنخواہ اور سہولتیں بھی بہت زیادہ تھیں۔ اس لیے میری تنخواہ اور سہولتیں بھی بہت زیادہ ہیں، لہٰذا میں نے یہ ملازمت اختیار کرلی۔ جب یہ سب کچھ ہوگیا؛ تعلیم حاصل کرلی، ملازمت اختیار کرلی، تو اب مجھے کسی نے بتایا کہ یہ انشورنس کا کام حرام ہے، جائز نہیں۔ اب میں آپ سے اس کی تصدیق کرنے آیا ہوں کہ واقعتاً یہ حرام ہے یا حلال ہے؟

انشورنس کا ملازم کیا کرے؟

میں نے اس سے کہا کہ اس وقت انشورنس کی جتنی صورتیں رائج ہیں، ان میں کسی میں سود ہے، کسی میں جوا ہے، اس لیے وہ سب حرام ہیں اور اس وجہ سے انشورنس کمپنی میں ملازمت بھی جائز نہیں، البتہ ہمارے بزرگ یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی بینک میں یا انشورنس کمپنی میں ملازم ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے لیے دوسرا حلال اور جائز ذریعہ معاش تلاش کرے اور اہتمام اور کوشش کے ساتھ اس طرح تلاش کرے جیسے ایک بے روزگار تلاش کرتا ہے اور جب اس کو دوسرا حلال ذریعہ آمدنی مل جائے تو اس وقت اس حرام ذریعہ کو چھوڑ دے۔ یہ بات ہمارے بزرگ اس لیے فرماتے ہیں کہ کچھ پتہ نہیں کہ کس کے حالات کیسے ہوں، اب اگر کوئی شخص فوراً اس حرام ذریعہ کو چھوڑ دے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی پریشانی میں مبتلا ہو جائے، پھر شیطان آ کر اس کو یہ بہکا دے کہ دیکھو تم دین پر عمل کرنے چلے تھے تو اس کے نتیجے میں تم پر یہ مصیبت آ گئی۔ اس لیے ہمارے بزرگ فرماتے ہیں کہ اس حرام ملازمت کو فوراً مت چھوڑو، بلکہ دوسری جگہ ملازمت تلاش کرو، جب حلال روزگار مل جائے تو اس وقت اس کو چھوڑ دینا۔

میں مشورہ لینے نہیں آیا

میرا یہ جواب سن کر وہ نوجوان مجھ سے کہنے لگا کہ مولانا صاحب! میں آپ سے یہ مشورہ لینے نہیں آیا کہ ملازمت چھوڑ دوں یا نہ چھوڑوں؟ میں آپ سے صرف یہ بات پوچھنے آیا ہوں کہ یہ کام حلال ہے یا حرام ہے؟ میں نے اس سے کہا کہ حلال اور حرام ہونے کے بارے میں بھی میں نے آپ کو بتا دیا اور ساتھ

میں بزرگوں سے جو بات سنی تھی وہ بھی آپ کو بتادی۔ اس نوجوان نے کہا کہ آپ مجھے اس کا مشورہ نہ دیں کہ میں ملازمت چھوڑوں یا نہ چھوڑوں۔ بس! آپ مجھے صاف اور دوٹوک لفظوں میں یہ بتادیں کہ یہ ملازمت حلال ہے یا نہیں؟ میں نے کہا حرام ہے۔ اس نوجوان نے کہا کہ یہ بتائیں کہ اس کو اللہ نے حرام کیا ہے یا آپ نے حرام کیا ہے؟ میں نے کہا کہ اللہ نے حرام کیا ہے۔ اس نوجوان نے کہا کہ جس اللہ نے اس کو حرام کیا ہے وہ مجھے رزق سے محروم نہیں کرے گا، لہٰذا اب میں یہاں سے اس دفتر میں واپس نہیں جاؤں گا۔ جب اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے تو وہ ایسا نہیں کرے گا کہ مجھ پر رزق کے دروازے بند کردے، لہٰذا میں آج ہی سے اس کو چھوڑتا ہوں۔

ظاہری شکل پر مت جاؤ

اب دیکھیے! ظاہری شکل وصورت سے دور دور تک پتہ نہیں لگتا تھا کہ اس اللہ کے بندے کے دل میں ایسا پختہ ایمان ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایسا پختہ بھروسہ ہوگا اور توکل ہوگا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو ایسا پختہ توکل عطا فرمایا تھا اور واقعتاً اس نوجوان نے وہ ملازمت اسی دن چھوڑ دی، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو خوب نوازا اور دوسرے حلال روزگار اس کو عطا فرمائے، وہ اب امریکہ میں ہے، آج تک اس نوجوان کی یہ بات میرے دل پر نقش ہے۔

بہرحال! کسی کی ظاہری حالت دیکھ کر ہم اس پر کیا حکم لگائیں، معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں ایمان کی کیسی شمع روشن کی ہوئی ہے اور اس کو اپنی ذات پر کیسا بھروسہ اور کیسا توکل عطا فرمایا ہوا ہے؟ لہٰذا کسی بھی انسان کی

تحقیر مت کرو، جو صاحب ایمان ہے اور اس کو اللہ تعالیٰ نے "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کی دولت عطا فرمائی ہے، وہ قابل اکرام ہے۔ اسی وجہ سے ہر صاحب ایمان کے اکرام کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

ہر بیشہ گمان مبر کہ خالی است
شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

یعنی گمان مت کرو کہ ہر جنگل خالی ہوگا، پتہ نہیں کیسے کیسے شیر اور چیتے اس میں سوئے ہوئے ہوں گے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی کو ایمان کی دولت عطا فرمادیں تو اب ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اس صاحبِ ایمان کی قدر کریں، اس کی عزت کریں اور اس کے ایمان کا اکرام کریں جو اس کے دل میں ہے۔

معزز کافر کا اکرام

ویسے تو ہر مسلمان کے اکرام کا حکم دیا گیا ہے، لیکن اس حدیث میں یہاں تک فرمایا کہ اگر آنے والا کافر ہی کیوں نہ ہو، مگر وہ اپنی قوم میں معزز سمجھا جاتا ہے، اس کی عزت کی جاتی ہے، لوگ اس کو احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس کو اپنا بڑا مانتے ہیں، چاہے وہ کافر اور غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، اس کے آنے پر بھی تم اس کا اکرام کرو اور اس کی عزت کرو۔ یہ اسلامی اخلاق کا ایک تقاضہ ہے کہ اس کی عزت کی جائے۔ یہ عزت اس کے کفر کی نہیں ہے، کیوں کہ اس کے کفر سے تو نفرت اور کراہیت کا معاملہ کریں گے، لیکن چونکہ اس کو اپنی قوم میں باعزت سمجھا جاتا ہے، اس لیے جب وہ تمہارے پاس آئے تو تم اس کی مدارات

کے لیے اس کا اکرام کرو۔ ایسا نہ ہو کہ اس سے نفرت کرنے کے نتیجے میں تم ان کے ساتھ ایسا برتاؤ اختیار کرلو کہ وہ تم سے اور تمہارے دین ہی سے متنفر ہوجائے، اس لیے اس کا اکرام کرو۔

کافروں کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرزِ عمل

حضورِ اقدس نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا کر کے دکھایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کافروں کے بڑے بڑے سردار آیا کرتے تھے، جب وہ سردار حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آتے تو ان کو کبھی یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہماری بے عزتی ہوئی ہے، بلکہ آپ نے ان کی عزت کی، ان کا اکرام کیا، ان کو عزت سے بٹھایا اور عزت کے ساتھ ان سے بات کی۔ یہ ہے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنّت کہ اگر کافر بھی ہمارے پاس آجائے تو اس کو بھی بے عزتی کا احساس نہ ہو۔

ایک کافر شخص کا واقعہ

حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے گھر میں تشریف فرما تھے۔ سامنے سے ایک صاحب آتے ہوئے دکھائی دیے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آپ کے قریب تشریف فرما تھیں، آپ نے فرمایا اے عائشہ! یہ شخص جو سامنے سے آرہا ہے یہ اپنے قبیلے کا برا آدمی ہے، پھر جب وہ شخص حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آیا تو آپ نے کھڑے ہوکر اس کا اکرام کیا اور بڑی عزت کے ساتھ اس سے بات چیت کی۔ جب وہ شخص بات چیت کرنے کے بعد واپس چلا گیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ یا رسول اللہ! آپ نے خود ہی تو فرمایا تھا کہ یہ شخص اپنے قبیلے کا برا آدمی ہے، لیکن جب یہ شخص

آ گیا تو آپ نے اس کی بڑی عزت کی اور اس سے بڑی نرمی کے ساتھ پیش آئے، اس کی کیا وجہ ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''وہ آدمی بہت برا ہے جس کے شر سے بچنے کے لیے اس کا اکرام کیا جائے۔''(۱)

یہ غیبت جائز ہے

اس حدیث میں دو سوال پیدا ہوتے ہیں: پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ شخص دور سے چلتا ہوا آرہا تھا تو اس کے آنے سے پہلے ہی اس کی پیٹھ پیچھے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے اس کی برائی بیان کی کہ یہ شخص اپنے قبیلے کا برا آدمی ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو غیبت ہے، اس لیے کہ پیٹھ پیچھے ایک آدمی کی برائی بیان کی جارہی ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ حقیقت میں یہ غیبت نہیں، اس لیے کہ اگر کسی شخص کو کسی دوسرے شخص کے شر سے بچانے کی نیت سے اس کی برائی بیان کی جائے تو یہ غیبت نہیں۔ مثلاً کوئی شخص کسی دوسرے کو متنبہ کرنے کے لیے اس سے کہے کہ تم فلاں شخص سے ذرا محتاط رہنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں دھوکہ دے جائے یا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہیں تکلیف پہنچائے تو یہ غیبت میں داخل نہیں، حرام اور ناجائز نہیں، بلکہ بعض صورتوں میں یہ بتانا واجب ہوجاتا ہے۔ مثلاً آپ کو یقینی طور پر معلوم ہے کہ فلاں شخص فلاں آدمی کو دھوکہ دے گا اور اس دھوکے کے نتیجے میں اس دوسرے شخص کو مالی یا جانی سخت تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہے تو آپ پر واجب ہے کہ آپ اس دوسرے شخص کو بتادیں کہ دیکھو فلاں آدمی تمہیں دھوکہ دینا چاہتا ہے، تاکہ وہ

---

(۱) صحیح البخاری ۱۳۸/۸ (۶۰۳۲) وصحیح مسلم ۲۰۰۲/۴ (۲۵۹۱)

شر سے محفوظ رہے۔ یہ غیبت میں داخل نہیں۔

لہٰذا جب حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو یہ بتایا کہ یہ شخص قبیلے کا برا آدمی ہے، تو اس بتانے کا منشا یہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ شخص حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو کسی وقت دھوکہ دے جائے یا کہیں اس شخص پر اعتماد اور بھروسہ کرتے ہوئے خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یا کوئی دوسرا مسلمان کوئی ایسا کام کرگزرے جس کی وجہ سے بعد میں انہیں پچھتاوا ہو۔ اس لیے آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس کے بارے میں پہلے سے بتادیا۔

برے آدمی کا آپ نے اکرام کیوں کیا؟

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو آپ نے اس کی برائی بیان فرمائی اور دوسری طرف جب وہ شخص آ گیا تو آپ نے اس کی بڑی عزت فرمائی اور بڑی خاطر تواضع فرمائی۔ اس میں ظاہر اور باطن میں فرق ہوگیا کہ سامنے کا معاملہ کچھ ہے اور پیچھے کچھ اور ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جنھوں نے ایک ایک چیز کی حد بیان فرمائی ہے، لہٰذا متنبہ کرنے کے لیے تو آپ نے اتنا بتادیا کہ یہ شخص برا آدمی ہے، لیکن جب وہ شخص ہمارے پاس مہمان بن کر آیا ہے تو مہمان ہونے کی حیثیت سے بھی اس کا کچھ حق ہے، وہ یہ کہ ہم اس کے ساتھ عزت سے پیش آئیں اور اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کریں جو ایک مہمان کے ساتھ کرنا چاہیے، چنانچہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی برتاؤ فرمایا۔

وہ آدمی بہت برا ہے

اس حدیث میں ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اگر برے آدمی کا اکرام نہ کیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ وہ تمہیں کوئی تکلیف پہنچادے یا کسی مصیبت کے اندر مبتلا کردے یا تمہارے ساتھ وہ کوئی ایسا معاملہ کردے جس کے نتیجے میں تمہیں آئندہ پچھتانا پڑے، اس لیے اگر کسی برے آدمی سے ملاقات کی نوبت آجائے تو اس کا اکرام کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کے شر سے اپنی جان کو اور اپنے مال کو اور اپنی آبرو کو بچانا بھی انسان کے فرائض میں داخل ہے۔ اسی لیے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس حدیث میں صاف صاف ارشاد فرمایا کہ ''وہ آدمی بہت برا ہے جس کے شر سے بچنے کے لیے لوگ اس کا اکرام کریں۔'' لوگ اس کا اکرام اس لیے نہیں کررہے ہیں کہ وہ آدمی اچھا ہے، بلکہ اس لیے اس کا اکرام کررہے ہیں کہ اگر اس کا اکرام نہیں کریں گے تو یہ تکلیف پہنچائے گا۔ ایسی صورت میں بھی اکرام کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، بشرطیکہ وہ اکرام جائز حدود کے اندر ہو اور اس کی وجہ سے کسی گناہ کا ارتکاب نہ کیا جائے۔

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اسوۂ مبارکہ کے ایک ایک جز میں نہ جانے کتنے بے شمار سبق ہمارے اور آپ کے لیے موجود ہیں۔ آپ نے غیبت کی حد بتادی کہ اتنی بات غیبت ہے، اتنی بات غیبت میں داخل نہیں اور اکرام کرنا کوئی منافقت نہیں، بلکہ حکم یہ ہے کہ وہ آنے والا خواہ کیسا ہی کافر اور فاسق و فاجر ہو، لیکن جب وہ تمہارے پاس مہمان بن کر آئے تو اس کی عزت کرو، اس کا اکرام کرو، کیوں کہ یہ بات منافقت میں داخل نہیں۔

سرسید کا ایک واقعہ

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سرسید کا یہ واقعہ سنا۔ اب تو وہ اللہ کے پاس چلے گئے، اب اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا معاملہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی عقائد کے اندر جو گڑبڑ کی ہے وہ بڑی خطرناک قسم کی ہے، مگر چونکہ ابتداءً وہ بزرگوں کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے اور باقاعدہ عالم بھی تھے، اس لیے ان کے اخلاق اچھے تھے۔ بہرحال! حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا یہ واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ وہ اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ کچھ بے تکلف دوست بھی تھے، سامنے دور سے ان کو ایک آدمی آتا ہوا دکھائی دیا، وہ آنے والا عام ہندوستانی لباس پہنا ہوا چلا آ رہا تھا، لیکن جب وہ کچھ قریب آ گیا تو باہر ہی ایک حوض کے پاس آ کر کھڑا ہوگیا، اس کے ایک ہاتھ میں ایک تھیلا تھا، اس تھیلے میں سے اس نے ایک عربی جبہ نکالا، اور عرب لوگ سر پر رومال کے اوپر جو ڈوری باندھتے ہیں وہ نکالی اور ان دونوں کو پہنا اور پھر قریب آنے لگا۔ سرسید صاحب دور سے یہ منظر دیکھ رہے تھے، آپ نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ یہ جو شخص آ رہا ہے یہ فراڈی آدمی معلوم ہو رہا ہے اس لیے کہ یہ شخص اب تک تو سیدھے سادھے ہندوستانی لباس میں آ رہا تھا، یہاں قریب آ کر اس نے اپنا چولہ بدل لیا ہے اور عربی لباس پہن لیا ہے، اب یہاں آ کر یہ اپنے آپ کو عرب ظاہر کرے گا اور پھر پیسے مانگے گا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ شخص ان کے پاس پہنچ گیا اور آ کر دروازے پر دستک دی، سرسید صاحب نے جا کر دروازہ کھولا اور عزت کے ساتھ ان کو اندر بلایا۔ سرسید نے پوچھا کہ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ

میں حضرت شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوں- یہ حضرت شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ بڑے اونچے درجے کے صوفیاءِ کرام میں سے تھے اور پھر اس شخص نے کچھ اپنی ضرورت بیان کی کہ میں اس ضرورت سے آیا ہوں، آپ میری کچھ مدد کریں چنانچہ سرسید صاحب نے پہلے اس کی خوب خاطر تواضع کی اور پھر جتنے پیسوں کی اس کو ضرورت تھی اس سے زیادہ لاکر اس کو دے دیے اور پھر بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ اس کو رخصت کردیا۔

آپ نے اس کی خاطر مدارات کیوں کی؟

جب وہ شخص واپس چلا گیا تو ان کے ساتھی نے سرسید صاحب سے کہا کہ آپ بھی عجیب انسان ہیں، آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس نے اپنا چولہ بدلا اور اپنا عام لباس اتار کر عرب لباس پہنا، پھر آپ نے خود کہا کہ یہ فراڈی ہے، آکر دھوکہ دے گا اور پیسے مانگے گا، اس کے باوجود آپ نے اس کی اتنی خاطر مدارات کی اور اس کو اتنے پیسے بھی دیے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

سرسید صاحب نے جواب دیا کہ بات دراصل یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ مہمان بن کر آیا تھا، اس لیے میں نے اس کی خاطر تواضع کی۔ جہاں تک پیسے دینے کا تعلق ہے، اس کے دھوکہ کی وجہ سے میں اس کو پیسے نہ دیتا، لیکن چونکہ اس نے ایک ایسے بڑے بزرگ کا نام لے لیا جس کے بعد میری جرأت نہیں ہوئی کہ میں انکار کروں، کیوں کہ حضرت شاہ غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان اولیاءِ کرام میں سے ہیں کہ اگر اس شخص کو ان سے دور دراز کی بھی نسبت تھی تو اس نسبت کا احترام کرنا میرا فرض تھا، شاید اللہ تعالیٰ میرے اس نسبت کے احترام پر میری مغفرت فرمادیں۔ اس لیے میں نے اس کو پیسے بھی دے دیے۔

دین کی نسبت کا احترام

یہ واقعہ میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا اور انہوں نے یہ واقعہ اپنے شیخ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے سنا اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ ایک طرف سرسید صاحب نے مہمان کا اکرام کیا اور دوسری طرف بزرگانِ دین کی نسبت کا احترام کیا، کیوں کہ جو شخص اللہ کا ولی ہے اور اس کی طرف کسی شخص کو ذرا سی بھی نسبت ہوگئی ہے اگر اس نسبت کا احترام کرلیا تو کیا پتہ کہ اللہ تعالیٰ اس نسبت کے اکرام ہی کی بدولت نوازش فرمادے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمادے۔ آمین۔

بہرحال! حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں فرمایا کہ کسی بھی قوم کا معزز آدمی آئے تو اس کا اکرام کرو۔

عام جلسے میں معزز کا اکرام

یہاں ایک بات اور عرض کردوں، وہ یہ کہ جو عام اجتماع گاہ یا مجلس یا مسجد ہوتی ہے اس کا عام قاعدہ یہ ہے کہ جو شخص مسجد میں یا کسی مجلس میں یا کسی اجتماع میں جس جگہ جا کر پہلے بیٹھ جائے وہی اس جگہ کا زیادہ حقدار ہے۔ مثلاً مسجد کی اگلی صف میں جا کر اگر کوئی شخص پہلے بیٹھ جائے وہ اس کا زیادہ حقدار ہے، اب دوسرے شخص کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اس سے کہے کہ بھائی! تم اس جگہ سے ہٹ جاؤ، یہاں میں بیٹھوں گا، بلکہ جس شخص کو جہاں جگہ مل جائے وہ وہاں بیٹھ جائے، لیکن اگر اسی مجلس میں یا عام اجتماع میں یا مسجد میں کوئی ایسا شخص آجائے جو اپنی قوم کا معزز فرد ہے تو اس کو آگے بٹھانا اور دوسروں سے آگے جگہ دینا بھی اس

حدیث کے مفہوم میں داخل ہے۔ ہمارے بزرگوں کا معمول یہ ہے کہ جب کسی مجلس میں سب لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہوں اور اس وقت کوئی معزز مہمان آجائے تو اس معزز مہمان کو اپنے قریب بٹھاتے ہیں اور اگر اس کو قریب بٹھانے کے لیے دوسروں سے یہ بھی کہنا پڑے کہ تھوڑا سا پیچھے ہوجائیں تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

یہ حدیث پر عمل ہو رہا ہے

یہ بات اس لیے عرض کردی کہ اس طرزِ عمل پر ہمارے بزرگوں کا معمول رہا ہے، جس کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ شریعت کا تو حکم یہ ہے کہ جو شخص پہلے آجائے اور اس کو جہاں جگہ مل جائے، وہ وہاں بیٹھ جائے۔ اب اگر کوئی شخص دیر سے آیا ہے اور اس کو پیچھے جگہ مل رہی ہے تو اس کو چاہیے کہ وہیں پیچھے بیٹھے، لیکن یہ بزرگ صاحب دوسروں کا حق پامال کر کے دیر سے آنے والے کو آگے کیوں بلا رہے ہیں؟ بات دراصل یہ ہے کہ وہ آگے بلانے والے بزرگ درحقیقت اس حدیث پر عمل فرماتے ہیں کہ

"إذا أتاكم كريم قوم فأكرموه"

یعنی جب تمہارے پاس کسی قوم کا معزز آدمی آجائے تو تم اس کا اکرام کرو۔

بلکہ ہمارے بزرگ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ (اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین) وہ اس بات کا بڑا خیال فرماتے تھے، یہاں تک کہ اگر کوئی بڑا آدمی مسجد میں آجاتا اور اگلی صف کے لوگ اس کو جگہ نہ دیتے

تو حضرت والا اس طرز عمل پر لوگوں کو خاص طور پر متنبہ فرماتے کہ بھائی یہ کیا انداز ہے؟ تمہیں چاہیے کہ اپنی جگہ سے ہٹ کر ایسے معزز آدمی کو جگہ دو اور اس کو یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ ناانصافی ہے، بلکہ یہ بھی اس حدیث کے ارشاد پر عمل کا ایک حصہ ہے۔

معزز کا اکرام باعث اجر ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث پر ایک جملہ تحریر فرمایا ہے، وہ بھی یاد رکھنے کا ہے، وہ یہ کہ

"کوئی شخص کافر ہو یا فاسق ہو، اگر اس کے آنے پر اس کا اکرام اس حدیث پر عمل کرنے کی نیت سے ہو تو ان شاء اللہ باعث اجر ہے، کیونکہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل ہے، لیکن اگر اس کا اکرام اس نیت سے کرے کہ میں اگر اس کا اکرام کروں گا تو یہ فلاں موقع پر میرے کام آئے گا یا فلاں موقع پر اس سے سفارش کراؤں گا یا اس سے فلاں دنیاوی مقصد حاصل کروں گا، گویا کہ ایک فاسق یا کافر کے اکرام کا مقصد دنیاوی لالچ ہے اور اس سے پیسے بٹورنا مقصود ہے یا اپنے لیے کوئی منصب حاصل کرنا ہے، تو اس صورت میں یہ اکرام درست نہیں۔"

لہٰذا اکرام کرتے وقت نیت درست ہونی چاہیے، یعنی یہ نیت ہونی چاہیے کہ چونکہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم دیا ہے اس لیے اس حکم

کی تعمیل میں یہ اکرام کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

بڑوں سے آگے مت بڑھو

(اصلاحی خطبات ۱۶/۲۰۶)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بڑوں سے آگے مت بڑھو

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِىَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا كَثِيْرًا۔ اَمَّا بَعْدُ!

فَاَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ① يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ

لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ [1]

آمنت باللّٰہ صدق اللہ مولانا العظیم، وصدق رسولہ النبی الکریم، ونحن علی ذالک من الشاھدین والشاکرین، والحمد للّٰہ رب العالمین۔

سورۃ الحجرات دو حصوں پر مشتمل ہے

بزرگانِ محترم و برادرانِ عزیز! میں نے آپ کے سامنے سورۃ الحجرات کی ابتدائی دو آیات تلاوت کیں، یہ سورت دو حصوں پر منقسم ہے، پہلا حصہ نبی اکرم سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم و تکریم اور آپ کے ساتھ معاملات کرنے کے آداب پر مشتمل ہے، یعنی مسلمانوں کو حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کس طرح معاملہ کرنا چاہیے اور دوسرا حصہ مسلمانوں کے باہمی معاشرت اور تعلقات کے احکام اور آداب پر مشتمل ہے۔

قبیلہ بنوتمیم کے وفد کی آمد

اس سورت کا پہلا حصہ جس واقعے کے پس منظر میں نازل ہوا، وہ واقعہ یہ تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں قبیلہ بنوتمیم کا ایک وفد مسلمان ہوکر آیا۔ اس زمانے میں مختلف قبائل کے وفود اسی غرض سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آرہے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلامی تعلیمات حاصل کررہے تھے، جب کوئی وفد واپس جانے کا ارادہ کرتا تو اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہی میں سے ایک کو

(۱) سورۃ الحجرات آیت (۱و۲)۔

ان کا امیر مقرر فرمادیتے تا کہ آئندہ وہ امیر حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رابطہ رکھے اور آپ کے احکام اپنے قبیلے کے لوگوں تک پہنچانے میں معاون ثابت ہو۔

حضراتِ شیخین کا اپنے طور پر امیر مقرر کرنا

جب قبیلہ بنوتمیم کا وفد آیا اور اسلامی تعلیمات حاصل کر کے جانے کا ارادہ کیا تو اس وقت ان کے اندر بھی ایک کو امیر مقرر کرنا تھا، لیکن ابھی تک آپ نے کسی کو متعین فرما کر اعلان نہیں کیا تھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے، آپ بھی تشریف فرما تھے، قبل اس کے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود قبیلہ بنوتمیم کے لیے کسی امیر کا تعین فرمائیں، حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما نے آپس میں یہ مشورہ شروع کر دیا کہ بنوتمیم میں سے کس کو امیر بنانا چاہیے؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قعقاع ابن معبد کو امیر بنانے کی تجویز پیش کی اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اقرع بن حابس کو امیر بنانے کی تجویز پیش کی اور ہر ایک نے اپنی تجویز کے حق میں دلائل دینے شروع کر دیے، اس گفتگو کے دوران ان دونوں حضرات کی آوازیں بلند ہوگئیں، جبکہ حضورِ اکرم عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس مجلس میں موجود تھے، اس موقع پر سورۃ الحجرات کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں[1]۔

دو غلطیاں سرزد ہوئیں

ان آیات نے حضراتِ شیخین کو متنبہ فرمایا کہ اس خاص واقعے میں دو

(۱) صحیح البخاری ۱٦۸/۵ (٤٣٦٧) و ١٣٧/٦ (٤٨٤٧) وأسباب النزول للواحدی ص ٤٠١ (٧٥٢)

باتیں غلط ہوئیں۔ ایک یہ کہ جب ابھی تک حضور ﷺ نے یہ موضوع چھیڑا نہیں تھا کہ کس کو امیر بنایا جائے؟ نہ آپ نے خود کوئی اعلان کیا تھا، نہ آپ نے صحابہ کرام سے مشورہ طلب کیا تھا کہ بتاؤ کس کو امیر بنایا جائے؟ تو حضور ﷺ کے اعلان سے پہلے اور مشورہ طلب کرنے سے پہلے یہ گفتگو جو شروع کی گئی یہ مناسب نہیں تھی، بلکہ غلط اور قابل اعتراض تھی۔ دوسری غلطی یہ ہوئی کہ گفتگو کے دوران نبی کریم ﷺ کی موجودگی میں ان دونوں حضرات کی آوازیں بلند ہوگئیں، حالانکہ جب نبی کریم ﷺ کسی مجلس میں تشریف فرما ہوں تو کسی شخص کا بلند آواز سے بولنا آپ کی تعظیم اور تکریم کے مناسب نہیں تھا، اس لیے آئندہ اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔

پہلی غلطی پر تنبیہ

بہرحال! سورۃ الحجرات میں سب سے پہلے ان دو غلطیوں پر متنبہ کرتے ہوئے فرمایا:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو۔''

یہ اس آیت کا لفظی ترجمہ ہے، اس آیت کا پس منظر وہی ہے کہ ابھی نبی کریم ﷺ نے بنوتمیم میں سے کسی کو امیر بنانے کا مسئلہ چھیڑا نہیں تھا، نہ خود آپ نے اعلان کیا تھا اور نہ ہی صحابہ کرام سے مشورہ طلب کیا تھا، اس سے پہلے اپنی طرف سے اس کی گفتگو چھیڑ دینا یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے آگے بڑھنے کے مترادف تھا، اس پر تنبیہ فرمائی۔

یہ قرآن قیامت تک رہنمائی کرتا رہے گا

لیکن قرآنِ کریم کا یہ عجیب وغریب معجزانہ اسلوب ہے کہ بسا اوقات ایک آیت کسی خاص واقعہ پر نازل ہوتی ہے کہ کوئی واقعہ پیش آیا اور اس میں مسلمانوں کو تعلیم دینی مقصود تھی، کوئی ہدایت دینی مقصود تھی، اس پر آیت نازل فرمادی، لیکن یہ قرآنِ کریم قیامت تک کے انسانوں کی رہنمائی کے لیے آیا ہے، اس لیے الفاظ ایسے لاتے ہیں کہ جس سے وہ رہنمائی اس واقعہ کی حد تک محدود نہ رہے، بلکہ قیامِ قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لیے ایک ابدی رہنمائی ثابت ہو، چنانچہ اس میں یہ نہیں فرمایا کہ بنوتمیم کے وفد میں سے کسی ایک کو امیر بنانے کے سلسلے میں تم لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے سے پہلے کیوں بات شروع کردی۔ یہ نہیں فرمایا، بلکہ ایک عام حکم دے دیا کہ ''اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو''۔ اس ایک جملے سے بہت سارے احکام نکل رہے ہیں، کیا کیا احکام ہیں؟ آج کی محفل میں اسی کو بیان کرنا مقصود ہے۔

حضور کی اجازت کے بغیر گفتگو جائز نہیں

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو''۔ اس حکم سے ایک براہِ راست مفہوم تو یہ نکل رہا ہے کہ جو موضوع حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھی چھیڑا نہیں، اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور اجازت کے بغیر گفتگو کرنا جائز نہیں، یہ تو ایک واقعہ تھا، لیکن ہوسکتا ہے کہ آئندہ بھی اس طرح کی صورت پیش آجائے، اس لیے یہ حکم دے دیا کہ جو معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھی چھیڑا نہیں، اس پر اپنی طرف سے رائے زنی شروع نہ کرو۔

عالم سے پہلے گفتگو کرنا جائز نہیں

اسی آیت کے تحت علماء کرام نے فرمایا کہ چونکہ یہ قرآنِ کریم قیامت تک کے لیے ابدی ہدایت ہے، لہٰذا اگر چہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو ہمارے درمیان تشریف فرما نہیں رہے، لیکن ان کے وارثین ان شاء اللہ قیامت تک رہیں گے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ

"العلماء ورثة الانبياء"(۱)

یعنی: ''علماء انبیاء کے وارث ہیں۔''

اس لیے مفسرین نے فرمایا کہ یہی حکم ان مقتدا علماء کا بھی ہے جن کی بات لوگ سنتے ہوں اور مانتے ہوں، جن کو اللہ تعالیٰ نے دین اور شریعت کا علم عطا فرمایا ہو۔ ان کے بارے میں یہ حکم ہے کہ اگر ان کی مجلس میں کوئی سوال کیا گیا ہو تو ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر کسی شخص کا ان عالم کی اجازت کے بغیر اپنی طرف سے بول پڑنا اس عالم کی تعظیم و تکریم کے بھی خلاف ہے اور آدابِ مجلس کے بھی خلاف ہے اور بے ادبی ہے یا ابھی تک کسی موضوع پر گفتگو کرنے کی اجازت نہیں دی، اس سے پہلے لوگوں نے خود سے آپس میں اس موضوع پر گفتگو شروع کردی، یہ بھی آدابِ مجلس کے خلاف ہے اور بے ادبی ہے، البتہ اگر خود صاحبِ مجلس مشورہ طلب کرے کہ فلاں مسئلہ ہے، آپ حضرات اپنی رائے دیں، تو اس صورت میں آزادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کریں یا اگر کسی

---

(۱) سنن ابی داود ۳۱۷/۳ (۳٦٤١) وسنن الترمذی ٤١٤/٤ (٢٦٨٢) وقال الحافظ ابن حجر رحمه الله في "فتح البارى" ١٦٠/١: "وحَسَّنه حمزة الكناني، وضَعَّفه غيرهم باضطراب في سنده، لكن له شواهد يتقوى بها".

موضوع پر کوئی بات چھیڑنی ہے تو پہلے صاحبِ مجلس سے اجازت لے کہ کیا اس مسئلے پر گفتگو کرلی جائے؟ اگر وہ اجازت دے دے تو پھر بے شک اس پر گفتگو کریں، لیکن بغیر اجازت کے گفتگو شروع نہ کریں، کیونکہ اس کے نتیجے میں صاحبِ مجلس سے آگے بڑھنا لازم آئے گا، جس کی اس آیت میں ممانعت کی گئی ہے، اس آیت کا ایک براہِ راست مفہوم تو یہ تھا۔

راستے میں نبی یا علماء سے آگے بڑھنا

اس آیت سے دوسرا حکم یہ نکل رہا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہیں تشریف لے جارہے ہوں تو راستے میں چلنے کے دوران ان سے آگے بڑھنا بے ادبی ہے۔ آپ کی عظمت کا اور آپ کی تعظیم وتکریم کا تقاضہ یہ ہے کہ جب آپ کے ساتھ چلیں تو ذرا سا پیچھے ہوکر چلیں، آگے آگے نہ چلیں، یہ بھی اس آیت کے مفہوم میں داخل ہے۔ اس حکم کے بارے میں بھی مفسرین نے فرمایا کہ چونکہ یہ حکم بھی قیامِ قیامت تک کے لیے ہے، لہٰذا انبیاء کرام کے وارثین کے بارے میں بھی یہ حکم ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص اپنے کسی بڑے کے ساتھ، مثلاً کسی عالم کے ساتھ، شیخ کے ساتھ، استاد کے ساتھ چل رہا ہے تو اس کو ان سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے یا تو ساتھ ساتھ چلے یا ذرا سا پیچھے رہے، آگے بڑھنا بے ادبی ہے، جس کی اس آیت میں ممانعت کی گئی ہے، یہ دوسرا حکم تھا۔

سنّت کی اتباع میں کامیابی ہے

تیسرا حکم جو اس آیت سے نکلتا ہے، وہ یہ ہے کہ تمہاری دنیا وآخرت کی صلاح اور فلاح اور کامیابی کا دارومدار نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنّت کی اتباع میں

ہے، لہٰذا جو آپ کی سنّت ہو اس پر عمل کرو، آپ سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرو، یعنی آپ نے جس طرح زندگی گزاری ہے، جس میں آپ نے تمام اہل حقوق کو ان کا حق دیا، اپنے نفس کا حق ادا کیا، اپنے گھر والوں کا حق ادا کیا، اپنے ملنے جلنے والوں کا حق ادا کیا، اپنے دوست و احباب کا حق ادا کیا، اس طرح تم بھی حقوق ادا کرتے ہوئے زندگی گزارو، ایسا نہ ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے بڑھنے کا شائبہ پیدا ہو جائے، بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت پر عمل کرو۔

تین صحابہ کے عبادات کے ارادے

ایک حدیث میں آتا ہے کہ چند صحابہ کرام تشریف فرما تھے، انہوں نے آپس میں یہ گفتگو شروع کی کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا اونچا مقام عطا فرمایا ہے کہ کوئی دوسرا شخص اس مقام تک پہنچ ہی نہیں سکتا اور آپ گناہوں سے معصوم ہیں، آپ سے کوئی غلطی نہیں ہوسکتی اور اگر کوئی بھول چوک ہو تو قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرمادیا ہے کہ

لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ (1)

اللہ تعالیٰ نے آپ کی تمام اگلی پچھلی بھول چوک بھی معاف کردی ہیں۔ لہٰذا آپ کو زیادہ عبادت کرنے کی ضرورت نہیں، اس لیے آپ تو سو بھی جاتے ہیں اور دن میں افطار بھی کر لیتے ہیں، لیکن ہمیں تو جنت کی بشارت نہیں ملی ہے، جیسے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی ہوئی ہے، اس وجہ سے ہمیں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ عبادت کرنی چاہیے۔ اس گفتگو کے بعد ان میں سے ایک صحابی نے یہ کہا

---

(1) سورة الفتح آیت (۲)۔

کہ میں آج سے رات کو نہیں سوؤں گا، بلکہ ساری رات تہجد پڑھا کروں گا۔ دوسرے صحابی نے کہا کہ اب میں ساری زندگی روزے رکھوں گا، کوئی دن بھی روزے کے بغیر نہیں گزاروں گا۔ تیسرے صحابی نے کہا کہ زندگی بھر شادی نہیں کروں گا تاکہ میں بیوی بچوں میں مشغول ہونے کے بجائے عبادت میں مشغول رہوں اور عبادت سے غافل نہ ہوں۔

کوئی شخص نبی سے آگے نہیں بڑھ سکتا

اب آپ دیکھیے کہ ان تین صحابہ نے جو ارادے کیے وہ نیکی کے ارادے تھے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کا ارادہ کیا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پتہ چلا کہ ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ ارادے کیے ہیں، تو آپ نے ان تینوں کو بلوایا اور ان سے فرمایا کہ

"ان اتقاکم واعلمکم باللہ انا"

یعنی اللہ تعالیٰ کی جتنی معرفت مجھے حاصل ہے، اتنی معرفت کائنات میں کسی کو حاصل نہیں اور اللہ کا خوف اور تقویٰ جتنا اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا فرمایا ہے، کائنات میں کسی کو اتنا تقویٰ حاصل نہیں، اس کے باوجود میں سوتا بھی ہوں اور رات کو اُٹھ کر نماز بھی پڑھتا ہوں، کسی دن روزہ رکھتا ہوں، کسی دن روزہ نہیں رکھتا اور میں عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں یاد رکھو! اسی سنّت میں تمہارے لیے نجات ہے۔

"فمن رغب عن سنتی فلیس منی"

''اگر کوئی شخص میری سنّت سے اعراض کرے گا، تو وہ مجھ سے نہیں ہوگا۔''(۱)

اس حدیث کے ذریعے حضورِ اقدس ﷺ نے یہ بتادیا کہ دنیا و آخرت کی ساری صلاح اور فلاح نبیِ کریم ﷺ کی سنتوں کی اتباع میں ہے۔ کوئی شخص یہ چاہے کہ میں نبی سے آگے بڑھ جاؤں یا در کھیئے! کوئی شخص بھی نبی سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

حقوق کی ادائیگی اتباعِ سنّت ہے

ایک دوسری حدیث میں حضورِ اقدس ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح عبادت فرض کی ہے اور عبادت کی ترغیب دی ہے، اسی طرح تم پر کچھ حقوق بھی عائد کیے ہیں۔ تمہارے جان کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے ملنے جلنے والوں کا بھی تم پر حق ہے۔ جب تم ان تمام حقوق کی ادائیگی ایک ساتھ کروگے تو اتباعِ سنّت ہوگا، لیکن اگر راہبوں کی طرح جنگل میں جاکر بیٹھ گئے اور یہ کہا کہ میں دنیا کو چھوڑ کر یہاں پر ''اللہ اللہ'' کروں گا، یہ حضورِ اقدس ﷺ کی سنّت کی اتباع نہیں ہے۔ بہرحال! اس آیت کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو، بلکہ جس کام کو جس حد میں کرنے کا حکم دیا ہے، اس کام کو اسی حد میں رکھو، اس سے آگے نہ بڑھو۔

---

(۱) صحیح البخاری ۱۳/۱ (۲۰) و ۲/۷ (۵۰۶۳) و صحیح مسلم ۱۰۲۰/۲ (۱۴۰۱)۔

دین ''اتباع'' کا نام ہے

یاد رکھیے! اپنی خواہش اور اپنا شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں، بلکہ دین نام ہے اتباع کا۔ اللہ کے حکم کی اتباع، اللہ کے رسول ﷺ کی سنّت کی اتباع کا نام ''دین'' ہے، لہٰذا جس وقت اللہ اور اللہ کے رسول کا جو حکم آجائے اور آپ کی اتباع کا جو تقاضا ہو، وہی خیر ہے اور وہی اطاعت ہے اور اسی میں تمہاری دنیا و آخرت کی کامیابی ہے، اپنی طرف سے کوئی راستہ مقرر کر کے چل پڑنا کہ میں تو یہ کروں گا، یہ بات صحیح نہیں۔ لہٰذا اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو، اگر کوئی شخص یہ سوچے کہ جو کام حضورِ اقدس ﷺ نے کیا تھا، مجھے تو وہ کام کرتے ہوئے شرم آتی ہے تو گویا وہ شخص یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ میرا حضورِ اقدس ﷺ سے زیادہ اونچا مقام ہے، میں بڑا آدمی ہوں، اس لیے یہ کام میں نہیں کرتا۔ العیاذ باللہ! یہ بھی درحقیقت حضورِ اقدس ﷺ سے آگے بڑھنے میں داخل ہے، اس کی متعدد مثالیں حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے واقعات میں ملتی ہیں۔

بارش میں گھر میں نماز پڑھنے کی رخصت

ایک مرتبہ حضورِ اقدس ﷺ نے یہ حکم دیا کہ جب بارش ہو رہی ہو اور کیچڑ اتنا زیادہ ہو جائے کہ لوگوں کو اس میں چلنے میں بہت زیادہ دِقت ہو اور پھسلنے کا اندیشہ ہو، پاؤں لت پت ہو جائے اور کپڑے خراب ہو جانے کا اندیشہ ہو تو شریعت نے ایسے موقع پر رخصت دی ہے کہ مسجد کے بجائے آدمی گھر میں نماز پڑھ لے۔ اب آج کل ہم لوگ شہر میں رہتے ہیں، جہاں گلیاں اور سڑکیں پکی

بنی ہوئی ہیں، اس لیے یہاں بارش ہونے سے یہ صورت حال پیدا نہیں ہوتی کہ اتنا کیچڑ ہوجائے کہ آدمی کے لیے چلنا دشوار ہوجائے، لیکن جہاں کچے مکانات اور کچی گلیاں ہوں، وہاں آج بھی یہ حکم موجود ہے کہ ایسی صورت میں جماعت معاف ہوجاتی ہے اور آدمی کے لیے گھر میں نماز پڑھنا جائز ہوجاتا ہے [1]۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا واقعہ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے بیٹے ہیں، وہ ایک مرتبہ مسجد میں بیٹھے تھے، اذان کا وقت ہوگیا اور ساتھ ہی تیز موسلا دھار بارش شروع ہوگئی، مؤذن نے اذان دی، اس کے بعد آپ نے مؤذن سے کہا کہ یہ اعلان کردو کہ

"الصلوٰۃ فی الرحال"

یعنی سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں نماز پڑھیں اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہی الفاظ ثابت ہیں کہ ایسے موقع پر یہ اعلان کردینا چاہیے۔ اب لوگوں کے لیے یہ بات بڑی اجنبی تھی، اس لیے کہ ساری زندگی تو دیکھتے آرہے تھے کہ مسجد سے تو یہ اعلان ہوتا ہے کہ

"حَیَّ علی الصلوٰۃ، حَیَّ علی الفلاح"

نماز کے لیے آؤ، کامیابی کے لیے آؤ۔

لیکن یہاں اُلٹا اعلان ہورہا ہے کہ اپنے گھروں میں نماز پڑھو، چنانچہ

---

(۱) صحیح البخاری ۱۲۹/۱ (۶۳۲) و ۱۳٤/۱ (٦٦٦) وصحیح مسلم ٤٨٤/۱ (٦٩٧)
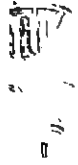
لوگوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما پر اعتراض کیا کہ حضرت! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ آپ لوگوں کو مسجد میں آنے سے منع کر رہے ہیں؟ جواب میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

"نعم! فعل ذلك من هو خير مني و منك"

ہاں میں ایسا ہی اعلان کراؤں گا، کیونکہ یہ اعلان اس ذات نے بھی کرایا ہے جو مجھ سے بھی بہتر ہے اور تم سے بھی بہتر ہے (یعنی حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) [1]۔

لہٰذا اگر کوئی شخص یہ کہے کہ مجھے تو اعلان کرنا بُرا لگتا ہے اور مجھے ایسا اعلان کرتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہو۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ اعلان فرمایا اور یہ رخصت دی اور تم کہتے ہو کہ میں یہ رخصت نہیں دیتا، مجھے یہ اعلان کرنا بُرا لگتا ہے۔ بہرحال! دین کے کسی بھی معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنّت اور آپ کی تعلیم سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنے کی ممانعت بھی اس آیت کے مفہوم میں داخل ہے۔
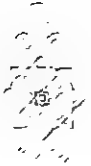
اللہ سے ڈرو

آگے فرمایا:

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ① [2]

"اللہ سے ڈرو، اللہ تعالیٰ سب کچھ سن رہے ہیں اور سب

(۱) صحيح البخاري ۱/۱۳٦ (٦١٦) و ۱/۱۳٤ (٦٦٨)
(۲) سورۃ الحجرات آیت (۱)۔

کچھ جانتے ہیں۔"

بہرحال! اللہ اور اللہ کے رسول سے آگے بڑھنے کی تین مثالیں تو میں نے آپ کے سامنے عرض کردیں، کچھ اور مثالیں ابھی بیان کرنا باقی ہیں، وقت ختم ہو رہا ہے۔ اللہ نے زندگی عطاء فرمائی تو آئندہ جمعہ میں عرض کروں گا۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین
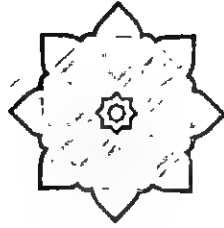
بیمار کی عیادت کے آداب

(اصلاحی خطبات ۶ / ۱۶۳)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بیمار کی عیادت کے آداب

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ، وَأَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَأَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا۔ أَمَّا بَعْدُ!

عن البراء بن عازب رضی اللہ عنہ قال: امرنا رسول الله ﷺ بسبع: "عيادة المريض، واتباع الجنائز، وتشميت العاطس، ونصر الضعيف، وعون المظلوم، وافشاء السلام، وابرار المقسم."[1]

(۱) صحيح البخاری ۱۲۹/۳ (۲۴۴۵) و ۲۴/۷ (۵۱۷۵) وصحيح مسلم ۱۶۳۵/۳ (۲۰۶۶)۔

سات باتیں

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہمیں سات باتوں کا حکم دیا:

① مریض کی عیادت کرنا

② جنازوں کے پیچھے چلنا

③ چھینکنے والے کے الحمد للہ کے جواب میں یرحمك اللہ کہنا۔

④ کمزور آدمی کی مدد کرنا

⑤ مظلوم کی امداد کرنا

⑥ سلام کو رواج دینا

⑦ قسم کھانے والے کی قسم کو پورا کرنے میں تعاون کرنا۔

یہ ساتوں چیزیں جن کا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس حدیث میں حکم فرمایا ہے، بڑی اہمیت رکھتی ہیں، اس لیے ایک مسلمان کی زندگی کے آداب میں سے ہے کہ وہ ان باتوں کا اہتمام کرے، اس لیے ان ساتوں چیزوں کو تفصیل کے ساتھ عرض کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان تمام باتوں پر سنّت کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

بیمار پرسی ایک عبادت

سب سے پہلی چیز جس کا حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا وہ ہے مریض کی عیادت کرنا اور بیمار کی بیمار کی پرسی کرنا۔ مریض کی عیادت کرنا یہ مسلمان کے

حقوق میں سے بھی ہے اور یہ ایسا عمل ہے جس کو ہم سب کرتے ہیں، شاید ہی دنیا میں کوئی ایسا شخص ہوگا جس نے زندگی میں کبھی بیمار پرسی نہ کی ہو، لیکن ایک بیمار پرسی تو صرف رسم پوری کرنے کے لیے کی جاتی ہے کہ اگر ہم اس بیمار کی عیادت کرنے کے لیے نہ گئے تو لوگوں کو شکایت ہوگی، ایسی صورت میں انسان دل پر جبر کرکے عیادت کرنے کے لیے جاتا ہے۔ اس لیے کہ دل میں اخلاص نہیں ہے، ایک عیادت تو یہ ہے، لیکن حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جس عیادت کا ذکر فرما رہے ہیں یہ وہ عیادت ہے جس کا مقصد اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے علاوہ کچھ اور نہ ہو، اخلاص کے ساتھ اجر وثواب حاصل کرنے کی نیت سے انسان عیادت کرے۔ احادیث میں جو فضائل بیان کیے گئے ہیں وہ اسی عیادت پر مرتب ہوتے ہیں۔

سنّت کی نیت سے بیمار پرسی کریں

مثلاً آپ ایک شخص کی عیادت کرنے جا رہے ہیں اور دل میں یہ خیال ہے کہ جب ہم بیمار پڑیں گے تو یہ بھی ہماری عیادت کے لیے آئے گا، لیکن اگر یہ ہماری عیادت کے لیے نہیں آئے گا تو پھر آئندہ ہم بھی اس کی عیادت کے لیے نہیں جائیں گے، ہمیں اس کی عیادت کی کیا ضرورت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ عیادت ''بدلے'' کے لیے ہو رہی ہے، رسم پوری کرنے کے لیے ہو رہی ہے، ایسی عیادت پر کوئی ثواب نہیں ملے گا، لیکن جب عیادت کرنے سے اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہو تو اس صورت میں آدمی یہ نہیں دیکھتا کہ میں جب بیمار ہوا تھا، اس وقت یہ میری عیادت کے لیے آیا تھا یا نہیں؟، بلکہ وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر یہ نہیں بھی آیا تھا تب بھی میں اس کی عیادت کے لیے اس کے پاس جاؤں

گا، کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عیادت کا حکم دیا ہے، اس سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ عبادت خالصتاً اللہ کے لیے کی جارہی ہے۔

شیطانی حربہ

یہ شیطان ہمارا بڑا دشمن ہے، اس نے ہماری اچھی خاصی عبادتوں کا ملیامیٹ کر رکھا ہے، اگر ان عبادتوں کو ہم صحیح نیت اور ارادے سے کریں تو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں بڑا اجر و ثواب ملے اور آخرت کا بڑا ذخیرہ جمع ہوجائے، لیکن شیطان یہ نہیں چاہتا کہ ہمارے لیے آخرت میں اجروثواب کا بڑا ذخیرہ تیار ہوجائے، اس لیے وہ ہماری بہت سی عبادتوں میں نیتوں کو خراب کرتا رہتا ہے۔ مثلاً عزیزوں اور رشتے داروں یا دوست احباب سے میل ملاقات کرنا، ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا، ان کو ہدیہ اور تحفہ دینا، یہ سب بڑے اجروثواب کے کام ہیں اور سب دین کا حصہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہیں اور ان کاموں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑے اجر وثواب کے وعدے ہیں، لیکن شیطان نیت کو خراب کردیتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ شخص یہ سوچتا ہے کہ جو شخص میرے ساتھ جیسا سلوک کرے گا میں بھی اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کروں گا۔ مثلاً فلاں شخص کے گھر سے میرے گھر کبھی ہدیہ نہیں آیا، میں اس کے گھر کیوں ہدیہ بھیجوں؟ جب میرے ہاں شادی ہوئی تھی تو اس نے کچھ نہیں دیا تھا، میں اس کے ہاں شادی میں کیوں ہدیہ دوں؟ اور فلاں شخص نے چونکہ ہمارے ہاں شادی کے موقع پر تحفہ دیا تھا، لہٰذا میں بھی اس کی شادی میں ضرور تحفہ دوں گا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک مسلمان بھائی کو ہدیہ اور تحفہ دینے کا عمل جس کی حضورِ اقدس سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی فضیلت بیان فرمائی تھی۔

شیطان نے اس کے اجر وثواب کو خاک میں ملادیا اور اب آپس میں ہدیہ اور تحفہ کا جو لین دین ہورہا ہے، وہ بطورِ رسم کے ہورہا ہے اور بطور ''نیوتہ'' ہورہا ہے، یہ صلہ رحمی نہیں ہے۔

صلہ رحمی کی حقیقت

صلہ رحمی وہ ہے جو اس بات کو دیکھے بغیر کی جائے کہ دوسرے نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات پر قربان جایئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

''لیس الواصل بالمکافی ولکن الواصل الذی اذا قطعت رحمه وصلها''(۱)

یعنی وہ شخص صلہ رحمی کرنے والا نہیں جو مکافات کرے اور بدلہ دے اور ہر وقت اس ناپ تول میں لگا رہے کہ اس نے میرے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا اور میں اس کے ساتھ کیسا سلوک کروں، بلکہ صلہ رحمی کرنے والا درحقیقت وہ شخص ہے کہ دوسرے شخص کے قطع رحمی کرنے کے باوجود یہ اس کے ساتھ صلہ رحمی کر رہا ہے یا مثلاً دوسرا شخص تو اس کے لیے کبھی کوئی تحفہ نہیں لایا، لیکن یہ اس کے لیے تحفہ لے کر جارہا ہے اور اس نیت سے لے جارہا ہے کہ ہدیہ دینے کا مقصد تو اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہے اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنّت پر عمل کرنا ہے، لہٰذا اب یہ دوسرا شخص ہدیہ دے یا نہ دے میں تو ہدیہ دوں گا، اس لیے کہ میں ''بدلہ'' کا قائل نہیں ہوں میں اس کو درست نہیں سمجھتا۔ حقیقت میں ایسا شخص صلہ رحمی

(۱) صحیح البخاری ۸/۶(۵۹۹۱) وسنن ابی داود ۱۳۲/۲(۱۶۹۷)۔

کرنے والا ہے، لہٰذا ہر معاملے میں ترازو لے کر مت بیٹھ جایا کرو کہ اس نے میرے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا، جیسا اس نے کیا تھا میں بھی ویسا ہی کروں گا، یہ غلط ہے، بلکہ صلہ رحمی کو عبادت سمجھ کر انجام دینا چاہیے۔ جب آپ نماز پڑھتے ہیں تو کیا اس وقت آپ کو یہ خیال آتا ہے کہ میرا دوست تو نماز نہیں پڑھتا، اس لیے میں بھی نماز نہیں پڑھتا یا میرا دوست جیسی نماز پڑھتا ہے، میں بھی ویسی ہی پڑھوں۔ نماز کے وقت یہ خیال نہیں آتا اس لیے کہ اس کی نماز اس کے ساتھ، تمہاری نماز تمہارے ساتھ، اس کا عمل اس کے ساتھ، تمہارا عمل تمہارے ساتھ، بالکل اسی طرح صلہ رحمی بھی ایک عبادت ہے، اگر وہ صلہ رحمی کی عبادت انجام نہیں دے رہا ہے تو تم اس عبادت کو انجام دو اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کرو۔ اسی طرح اگر وہ تمہاری عیادت کے لیے نہیں آرہا ہے تو تم اس کی عیادت کے لیے جاؤ، اس لیے کہ عیادت کرنا بھی ایک عبادت ہے۔

بیمار پرسی کی فضیلت

یہ عبادت بھی ایسی عظیم الشان ہے کہ ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"أن المسلم إذا عاد أخاه المسلم لم يزل في خرفة الجنة حتى يرجع"(۱)

جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان بھائی کی عیادت کرتا ہے، جتنی دیر وہ عیادت کرتا ہے، وہ مسلسل جنت کے باغ

(۱) صحيح مسلم ۱۹۸۹/٤ (۲٥٦۸)۔

میں رہتا ہے۔ جب تک وہ واپس نہ آجائے۔

ایک دوسری حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"ما من مسلم يعود مسلماً غدوة الا صلّى عليه سبعونَ الف مَلَكٍ حتى يمسى، وإن عاده عشية إلّا صلّى عليه سبعونَ الف ملك حتىٰ يصبح، وكان له خريف في الجنة"(۱)

جب کوئی مسلمان بندہ اپنے مسلمان بھائی کی صبح کے وقت عیادت کرتا ہے تو صبح سے لے کر شام تک ستر ہزار فرشتے اس کے حق میں مغفرت کی دعا کرتے رہتے ہیں اور اگر شام کو عیادت کرتا ہے تو شام سے لے کر صبح تک ستر ہزار فرشتے اس کے حق میں مغفرت کی دعا کرتے رہتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ جنت میں اس کے لیے ایک باغ متعین فرمادیتے ہیں۔

ستر ہزار فرشتوں کی دعائیں حاصل کریں

یہ کوئی معمولی اجر وثواب ہے؟ فرض کریں کہ گھر کے قریب ایک پڑوسی بیمار ہے تم اس کی عیادت کے لیے چلے اور پانچ منٹ کے اندر اتنے عظیم الشان اجر کے مستحق بن گئے۔ کیا پھر یہ بھی دیکھو گے وہ میری عیادت کے لیے آیا تھا یا

(۱) سنن الترمذی ۲۹۰/۲ (۹۶۹) وقال: هذا حديث حسن غريب، وقد روي عن علي هذا الحديث من غير وجه، منهم من وقفه ولم يرفعه، وأبو فاختة اسمه سعيد بن علاقة.

نہیں؟ اگر اس نے یہ ثواب حاصل نہیں کیا، اگر اس نے ستر ہزار فرشتوں کی دعائیں نہیں لیں اگر اس نے جنت کا باغ حاصل نہیں کیا تو کیا تم یہ کہو گے کہ میں بھی جنت کا باغ حاصل نہیں کرنا چاہتا اور مجھے بھی ستر ہزار فرشتوں کی دعاؤں کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ اسے ضرورت نہیں۔ دیکھیے! اس اجر و ثواب کو اللہ تعالیٰ نے کتنا آسان بنادیا ہے، لوٹ کا معاملہ ہے۔ اس لیے عیادت کے لیے جاؤ، چاہے دوسرا شخص تمہاری عیادت کے لیے آئے یا نہ آئے۔

اگر بیمار سے ناراضگی ہو تو

بلکہ اگر وہ بیمار ایسا شخص ہے جس کی طرف سے تمہارے دل میں کراہیت ہے، اس کی طرف سے دل کھلا ہوا نہیں ہے، طبیعت کو اس سے مناسبت نہیں ہے، پھر بھی عیادت کے لیے جاؤ گے تو ان شاء اللہ دوہرا ثواب ملے گا۔ ایک عیادت کرنے کا ثوب اور دوسرے ایک ایسا مسلمان جس کی طرف سے دل میں انقباض تھا، اس پر علیحدہ ثواب ملے گا، لہٰذا مریض کی عیادت معمولی چیز نہیں ہے، خدا کے لیے رسم بنا کر اس کے ثواب کو ضائع مت کرو، صرف اس نیت سے عیادت کرو کہ یہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت ہے اور اس پر اللہ اجر عطا فرماتے ہیں۔

مختصر عیادت کریں

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عیادت کے بھی کچھ آداب بیان فرمائے، زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کی تفصیل آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان نہ فرمائی ہو، ایسے

ایسے آداب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بتا کر تشریف لے گئے، جن کو آج ہم نے بھلا دیا اور ان آداب کو زندگی سے خارج کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ زندگی عذاب بنی ہوئی ہے۔ اگر ہم ان آداب اور تعلیمات پر عمل کرنا شروع کر دیں تو زندگی جنت بن جائے، چنانچہ عیادت کے آداب بیان کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ

"أعظم العيادة أجراأخفها"[1]

سب سے زیادہ اجر والی عیادت وہ ہے جو زیادہ ہلکی پھلکی ہو۔

یعنی ایسا نہ ہو کہ ہمدردی کی خاطر عیادت کرنے جاؤ اور جا کر اس مریض کو تکلیف پہنچادو، بلکہ وقت دیکھ لو کہ یہ وقت عیادت کے لیے مناسب ہے یا نہیں؟ یہ وقت اس کے آرام کرنے کا تو نہیں ہے؟ یا اس وقت وہ گھر والوں کے پاس تو نہیں ہوگا؟ اس وقت میں اس کو پردہ وغیرہ کا انتظام کرانے میں تکلیف تو نہیں ہوگی، لہٰذا مناسب وقت دیکھ کر عیادت کے لیے جاؤ۔

یہ طریقہ سنّت کے خلاف ہے

اور جب عیادت کے لیے جاؤ تو مریض کے پاس تھوڑا بیٹھو، اتنا زیادہ مت

---

(۱) مسند البزار ۲۵۵/۲ (۶۶۳) من حديث على بن أبى طالب وقال: وأحسب أن ابن أبي فديك لم يسمع من علي بن عمر بن علي بن أبي طالب، وأورده الهيثمي في "المجمع" ۲۰/۳ (۳۷۶۲) واكتفى على كلام البزار. والحديث مذكور في "الجامع الصغير" ۲۵۷/۱ (۱۱۸۱) برمز الضعف. وقال المناوي في "فيض القدير" ۳/۲ (۱۱۸۱): وقد أشار المصنف بضعفه فإما أن يكون لانقطاعه، ولكونه مع الانقطاع فيه علة أخرى. ورواه ابن أبى الدنيا كما فى "مجموع الرسائل" ۲۸۳/٤ (۲۰۳) من حديث جابر بن عبد الله نحوه (طبع المكتبة العصرية) وقال العراقى فى "تخريج احاديث الإحياء" ۵۱۸/۱ (۲۰۰۳) وإسناده ضعيف. (طبع مكتبة طبرية)

بیٹھو جس سے اس کو گرانی ہونے لگے، حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون انسانی فطرت سے واقف ہوسکتا ہے۔ دیکھیے! بیمار کی طبعی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ ذرا بے تکلف رہے، ہر کام بلا تکلف انجام دے، لیکن جب کوئی مہمان آجاتا ہے تو اس کی وجہ سے طبیعت میں تکلف آجاتا ہے۔ مثلاً وہ پاؤں پھیلا کر لیٹنا چاہتا ہے، مہمان کے احترام کی وجہ سے نہیں کرسکتا، اب ہوا یہ کہ تم تو عیادت کی نیت سے ثواب کمانے کے لیے گئے، لیکن تمہاری وجہ سے وہ بیمار مشقت میں پڑ گیا، اس لیے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عیادت میں ایسا طریقہ اختیار مت کرو، جس کی وجہ سے اس مریض پر گرانی ہو، یہ نہ ہو کہ اس کے پاس جاکر جم کر بیٹھ گئے اور ہلنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ اب وہ بیچارہ نہ تو بے تکلفی سے کوئی کام انجام دے سکتا ہے نہ گھر والوں کو اپنے پاس بلاسکتا ہے، مگر آپ اس کی ہمدردی میں گھنٹوں اس کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ طریقہ سنّت کے خلاف ہے ایسی عیادت سے ثواب ہونے کے بجائے الٹا گناہ کا اندیشہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ جو بہت اونچے درجے کے صوفیاء میں سے ہیں، محدث بھی ہیں، فقیہ بھی ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو بہت سے کمالات عطا فرمائے تھے۔ ایک مرتبہ بیمار ہوگئے۔ اب چونکہ اللہ تعالیٰ نے بہت اونچا مقام عطا فرمایا تھا، اس لیے آپ سے محبت کرنے والے لوگ بھی بہت تھے۔ اس لیے بیماری کے دوران عیادت کرنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، لوگ آرہے ہیں اور خیریت پوچھ کر واپس جارہے ہیں، لیکن ایک صاحب ایسے آئے جو وہیں جم کر بیٹھ گئے اور واپس جانے کا نام ہی نہیں لیتے تھے حضرت عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ

کی خواہش یہ تھی کہ یہ صاحب واپس جائیں تو میں اپنے ضروری کام بلاتکلف انجام دوں اور گھر والوں کو اپنے پاس بلاؤں، مگر وہ صاحب تو ادھر اُدھر کی باتیں کرنے میں لگے رہے، جب بہت دیر گزر گئی اور وہ شخص جانے کا نام ہی نہیں لے رہا تو آخر حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے اس شخص سے فرمایا کہ بھائی یہ بیماری تو اپنی جگہ تھی، مگر عیادت کرنے والوں نے الگ پریشان کر رکھا ہے، نہ مناسب وقت دیکھتے ہیں اور نہ آرام کا خیال کرتے ہیں اور عیادت کے لیے آجاتے ہیں۔ اس شخص نے جواب میں کہا کہ حضرت! یقیناً ان عیادت کرنے والوں کی وجہ سے آپ کو تکلیف ہورہی ہے، اگر آپ اجازت دیں تو میں دروازے کو بند کردوں؟ تاکہ آئندہ کوئی عیادت کرنے کے لیے نہ آئے۔ وہ اللہ کا بندہ پھر بھی نہیں سمجھا کہ میری وجہ سے حضرت والا کو تکلیف ہورہی ہے۔ آخر کار حضرت عبد اللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے فرمایا کہ ہاں! دروازہ تو بند کردو، مگر باہر جاکر بند کردو۔(۱) بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ ہم تکلیف پہنچا رہے ہیں، بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم تو ان کی خدمت کر رہے ہیں۔

عیادت کے لیے مناسب وقت کا انتخاب کرو

لہٰذا اپنا شوق پورا کرنے کا نام عیادت نہیں اور نہ عیادت کا یہ مقصد ہے، اس کے ذریعے برکت حاصل ہو، یہ نہیں کہ بڑی محبت سے عیادت کے لیے گئے اور جاکر شیخ کو تکلیف پہنچادی۔ محبت کے لیے عقل درکار ہے، یہ نہیں کہ اظہار تو محبت کا

---

(۱) اس طرح کا واقعہ بغیر کسی نسبت ملا علی قاری نے مرقاۃ المفاتیح ۱۱۵۳/۳ میں نقل کیا ہے۔ (طبع دار الفکر)۔ واللہ اعلم۔ از مرتب۔

کررہے ہیں اور حقیقت میں تکلیف پہنچائی جارہی ہے، ایسی محبت محبت نہیں، بلکہ وہ دشمنی ہے، وہ نادان دوست کی محبت ہے، لہٰذا عیادت میں اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ جس شخص کی عیادت کے لیے گئے ہو اس کو تکلیف نہ ہو یا مثلاً آپ رات کو بارہ بجے عیادت کے لیے پہنچ گئے۔ جو اس کے سونے کا وقت ہے یا دوپہر کو آرام اور قیلولے کے وقت عیادت کے لیے پہنچ گئے اور اس کو پریشان کردیا۔ اس لیے عقل سے کام لو سوچ سمجھ کر جاؤ کہ تمہارے جانے سے اس کو تکلیف نہ پہنچے تب تو عیادت سنّت ہے ورنہ پھر وہ رسم ہے۔ بہرحال! حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عیادت کا پہلا ادب یہ بیان فرمایا کہ ہلکی پھلکی عیادت کرو۔

بے تکلف دوست زیادہ دیر بیٹھ سکتا ہے

البتہ بعض لوگ ایسے بے تکلف ہوتے ہیں کہ ان کے زیادہ دیر بیٹھنے سے بیمار کو تکلیف کے بجائے تسلی ہوتی ہے اور راحت حاصل ہوتی ہے تو ایسی صورت میں زیادہ دیر بیٹھنے میں کوئی حرج نہیں۔

میرے والد ماجد رحمہ اللہ کے ایک بے تکلف اور محبت کرنے والے استاذ حضرت میاں اصغر حسین صاحب رحمہ اللہ ایک مرتبہ بیمار ہوگئے تو حضرت والد صاحب رحمہ اللہ ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے، مسنون طریقے سے عیادت کی، جاکر سلام کیا، خیریت معلوم کی اور دعا کی اور دو چار منٹ کے بعد واپس جانے کی اجازت طلب کی، تو میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میاں! یہ جو تم نے اصول پڑھا ہے کہ

"من عادمنکم فلیخفف"
یعنی جو شخص عیادت کرے وہ ہلکی پھلکی عیادت کرے۔

کیا یہ میرے لیے ہی پڑھا تھا؟ یہ قاعدہ میرے اوپر آزمارہے ہو؟ ارے یہ اصول اس وقت نہیں ہے جب بیٹھنے والے کے بیٹھنے سے مریض کو آرام اور راحت ملے، تسلی ہو، اس کے لیے جلد واپس جانے کی ضرورت نہیں۔ آرام سے بیٹھ جاؤ، چنانچہ حضرت والد صاحب بیٹھ گئے۔ بہر حال ہر جگہ کے لیے ایک ہی نسخہ نہیں ہوتا، بلکہ جیسا موقع ہو، جیسے حالات ہو، ویسے ہی عمل کرنا چاہیے، لہٰذا اگر آرام و راحت پہنچانے کے لیے زیادہ بیٹھے گا تو ان شاء اللہ زیادہ ثواب حاصل ہوگا، اس لیے کہ اصل مقصود تو اس کو راحت پہنچانا ہے اور تکلیف سے بچانا ہے۔

مریض کے حق میں دعا کرو

عیادت کرنے کا دوسرا ادب یہ ہے کہ جب آدمی کسی کی عیادت کے لیے جائے تو پہلے مختصراً اس کا حال دریافت کرے کہ کیسی طبیعت ہے؟ جب وہ مریض اپنی تکلیف بیان کرے تو پھر اس کے حق میں دعا کرے، کیا دعا کرے؟ یہ بھی حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں سکھا گئے، چنانچہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ان الفاظ سے دعا دیا کرتے تھے۔

"لا بأس طھور ان شاء اللہ"[1]

یعنی اس تکلیف سے آپ کا کوئی نقصان نہیں، آپ کے لیے یہ تکلیف ان شاء اللہ آپ کے گناہوں سے پاک ہونے کا ذریعہ بنے گی۔

اس دعا میں ایک طرف تو مریض کو تسلی دے دی کہ تکلیف تو آپ کو ضرور

(۱) صحیح البخاری، ۲۰۲/۴ (۳۶۱۶) و ۱۱۷/۷ (۵۶۵۶)۔

ہے، لیکن یہ تکلیف گناہوں سے پاکی اور آخرت کے ثواب کا ذریعہ بنے گی۔ دوسری طرف یہ دعا بھی ہے کہ ”اے اللہ! اس تکلیف کو اس کے حق میں اجر و ثواب کا سبب بنا دیجیے اور گناہوں کی مغفرت کا ذریعہ بنا دیجیے۔“

بیماری گناہوں سے پاکی کا ذریعہ ہے

یہ حدیث آپ نے سنی ہوگی کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

”جس مسلمان کو جو کوئی تکلیف پہنچتی ہے حتیٰ کہ اگر اس کے پاؤں میں کانٹا بھی چھبتا ہے تو اللہ اس تکلیف کے عوض کوئی نہ کوئی گناہ معاف فرماتے ہیں اور اس کا درجہ بلند فرماتے ہیں“(۱)۔

ایک اور حدیث میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”اَلْحُمّٰی مِنْ فَیْحِ جَهَنَّمَ“(۲)

یعنی یہ ”بخار جہنم کی گرمی کا ایک حصہ ہے“۔

علماءِ کرام نے اس حدیث کی مختلف تشریحات کی ہیں۔ بعض علماء نے اس کا جو مطلب بیان فرمایا ہے اس کی بعض احادیث سے تائید بھی ہوتی ہے، وہ یہ کہ بخار کی گرمی انسان کے لیے جہنم کی گرمی کا بدلہ ہوگئی ہے۔ یعنی گناہوں کی وجہ سے آخرت میں جہنم کی جو گرمی برداشت کرنی پڑتی اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے یہ گرمی دے دی، تاکہ جہنم کے اندر ان گناہوں کی گرمی برداشت نہ کرنی پڑے، بلکہ اس بخار کی وجہ سے وہ گناہ دنیا ہی کے اندر دھل جائے اور

---

(۱) صحیح البخاری ۱۱۴/۷ (۵٦٤٠-۵٦٤١).

(۲) صحیح البخاری ۱۲۰/٤ (۳۲٦۱) و ۱۲۹/۷ (۵۷۲۳).

معاف ہوجائے، اس کی تائید اس دعا سے ہوتی ہے جو حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عیادت کے وقت کیا کرتے تھے:

"لا بأس طهور ان شاء الله"

یعنی کوئی غم نہ کرو یہ بخار تمہارے گناہوں سے پاکی کا ذریعہ اور سبب بن جائے گا۔

حصولِ شفاء کا ایک عمل

عیادت کرنے کا تیسرا ادب یہ ہے کہ اگر موقع مناسب ہو اور اس عمل کے ذریعے مریض کو تکلیف نہ ہو تو یہ عمل کرلے کہ مریض کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر یہ دعا پڑھے:

اَللّٰهُمَّ رَبَّ النَّاسِ أَذْهِبِ البَأْسَ اَنْتَ الشَّافِيْ لَا شَافِيَ اِلَّا اَنْتَ فَاشْفِيْهِ شِفَاءً لَّا يُغَادِرُ سَقَمًا (۱)

ترجمہ: اے اللہ! جو تمام انسانوں کے رب ہیں، تکلیف کو دور کرنے والے ہیں، اس بیمار کو شفا عطا فرما، آپ شفا دینے والے، آپ کے سوا کوئی شفا دینے والا نہیں اور ایسی شفاء عطا فرما جو کسی بیماری کو نہ چھوڑے۔

یہ دعا جس کو یاد نہ ہو اس کو چاہیے کہ اس کو یاد کرلیں اور پھر یہ عادت بنالیں کہ جس بیمار کے پاس جائیں موقع دیکھ کر یہ دعا ضرور پڑھ لیں۔

(۱) صحيح البخاري ۱۳۲/۷ (۵۷۴۳) و صحيح مسلم ۱۷۲۱/۴ (۲۱۹۱).

ہر بیماری سے شفا

ایک اور دعا بھی حضورِ اقدس ﷺ سے منقول ہے جو اس سے بھی زیادہ آسان اور مختصر ہے، اس کو یاد کرنا بھی آسان ہے اور اس کا فائدہ بھی حضورِ اقدس ﷺ نے بڑا عظیم بیان فرمایا ہے وہ دعا یہ ہے:

أَسْئَلُ اللّٰهَ الْعَظِيْمَ رَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ أَنْ يَشْفِيَكَ

میں عظمت والے اللہ! اور عظیم عرش کے مالک سے دعا کرتا ہوں کہ وہ تم کو شفا عطا فرمادے۔

حدیث میں ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو مسلمان بندہ دوسرے مسلمان بھائی کی عیادت کے وقت سات مرتبہ یہ دعا کرے تو اگر اس بیمار کی موت کا وقت نہیں آیا ہوگا تو پھر اس دعا کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس کو صحت عطا فرمادیں گے۔ ہاں! اگر کسی کی موت ہی کا وقت آچکا ہو تو اس کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔[1]

عیادت کے وقت زاویہ نگاہ بدل لو

اور ان دعاؤں کے پڑھنے میں تین طرح سے ثواب حاصل ہوتا ہے

(۱) سنن أبی داود ۱۸۷/۳ (۳۱۰٦) وسنن الترمذی ۵۹۳/۳ (۲۰۸۳) والحدیث سکت عنه أبو داود. وقال المنذری فی "مختصره" ۱٤٦/۳ (۲۹۷۷): وأخرجه الترمذی والنسائی، وقال الترمذی: "حسن غریب لا نعرفه إلا من حدیث المنهال بن عمرو." وهذا آخر كلامه. وفی إسناده یزید بن عبد الرحمن أبو خالد المعروف بالدالانی، وقد وثقه أبو حاتم الرازی، وتكلم فیه غیر واحد. والحدیث ذكره النووی فی "خلاصه الأحكام" ۹۱۲/۲ (۳۲۲۹) وقال: حدیث صحیح، رواه أبو داود (طبع مؤسسة الرسالة).

ایک ثواب تو اس بات کا ملے گا کہ آپ مریض کی عیادت کے دوران حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت پر عمل کیا اور وہ الفاظ کہے جو عیادت کے وقت حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کہا کرتے تھے، دوسرے ایک مسلمان بھائی کے ساتھ ہمدردی کا ثواب حاصل ہوگا۔ تیسرے اس کے حق میں دعا کرنے کا ثواب حاصل ہوگا، اس لیے کہ دوسرے مسلمان بھائی کے لیے دعا کرنا باعث اجر وثواب ہے، گویا کہ اس چھوٹے سے عمل کے اندر تین ثواب جمع ہیں، لہٰذا مریض کی عیادت تو ہم سب کرتے ہیں، لیکن عیادت کے وقت ذرا زاویۂ نگاہ بدل لو اور اتباعِ سنّت کی نیت کرلو اور اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی نیت کرلو اور عیادت کے جو آداب ہیں اس پر عمل کرلو (یعنی مختصر وقت کے لیے عیادت کرو اور عیادت کے وقت حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی دعائیں پڑھ لو، تو پھر ان شاء اللہ عیادت کا یہ معمولی سا عمل عظیم عبادت بن جائے گا۔) اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

دین کس چیز کا نام ہے؟

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبد الحیٔ عارفی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑے کام کی بات بیان فرماتے تھے، دل پر نقش کرنے کے قابل ہے، فرماتے تھے کہ ''دین صرف زاویۂ نگاہ کی تبدیلی کا نام ہے''، صرف ذرا سا زاویۂ نگاہ بدل لو تو یہی دنیا دین بن جائے گی، یہی سب کام جو اب تک تم نے انجام دیے تھے وہ سب عبادت بن جائیں گے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے کام بن جائیں گے، بشرطیکہ دو کام کرلو۔ ایک نیت درست کرلو دوسرے اس کا طریقہ سنّت کے مطابق انجام دے دو، بس اتنا کرنے سے وہی کام دین بن جائیں گے اور بزرگوں کے پاس جانے سے

یہی فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ انسان کا زاویۂ نگاہ بدل دیتے ہیں، سوچ کا انداز بدل دیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں انسان کے اعمال اور افعال کا رخ صحیح ہوجاتا ہے پہلے وہ دنیا کا کام تھا اور اب وہ دین کا کام بن جاتا ہے اور عبادت بن جاتا ہے۔

عیادت کے وقت ہدیہ لے جانا

مریض کی عیادت کے موقع پر ایک رسم ہمارے یہاں جاری ہے، وہ یہ کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ جب عیادت کے لیے جائیں تو کوئی ہدیہ، تحفہ ضرور لے کر جانا چاہیے۔ مثلاً پھل فروٹ یا بسکٹ وغیرہ اور اس کو اتنا ضروری سمجھ لیا گیا ہے کہ بعض لوگ جب تک کوئی ہدیہ لے کر جانے کی استطاعت نہیں ہوتی، عیادت کے لیے ہی نہیں جاتے اور دل میں یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر خالی ہاتھ چلے گئے تو وہ مریض یا مریض کے گھر والے کیا سوچیں گے کہ خالی ہاتھ عیادت کے لیے آگئے۔ یہ ایسی رسم ہے جس کی وجہ سے شیطان نے ہمیں عیادت کے عظیم ثواب سے محروم کردیا ہے، حالانکہ عیادت کے وقت کوئی ہدیہ، تحفہ لے کر جانا نہ سنّت ہے نہ فرض نہ واجب، پھر کیوں ہم نے اس کو اپنے اوپر لازم کرلیا ہے۔ خدا کے لیے اس رسم کو چھوڑ دو اور اس کی وجہ سے عیادت کے فضائل اور اس پر ملنے والے اجر وثواب سے محروم مت ہوجاؤ۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین کی صحیح فہم عطا فرمائے اور ہر کام سنّت کے مطابق انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

اصلاحی تقاریر ومضامین کا
موضوع وار مجموعہ
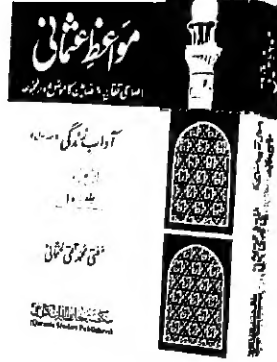
شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے جملہ مواعظ، خطبات اور تحریرات کا تخریج شدہ جامع اور مستند ترین موضوع وار مجموعہ ہے، اس مجموعہ میں حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کی درج ذیل کتب کا استیعاب کیا گیا ہے:

- حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
- اصلاحی خطبات
- اصلاحی مواعظ
- اصلاحی مجالس
- خطباتِ عثمانی
- خطبات دورۂ ہند
- درسِ شعب الایمان
- نشری تقریریں
- فردکی اصلاح
- اصلاحِ معاشرہ
- تربیتی بیانات
- ذکر وفکر
- the Islamic Months

اس کے علاوہ

- آسان ترجمہ قرآن
- اسلام اور ہماری زندگی
- انعام الباری
- تقریر ترمذی
- جہانِ دیدہ
- سفر در سفر
- دنیا مرے آگے
- اسلام اور جدید معاشی مسائل
- ہمارا معاشی نظام

کے منتخب مضامین، ماہنامہ البلاغ اور دیگر مجموعوں اور رسائل میں شائع شدہ، اور بعض صوتی صورتوں میں محفوظ شدہ حضرت والا دامت برکاتہم کے بیانات وخطبات کو شامل کیا گیا ہے، جس سے علماء، طلباء، خطباء اور عام پڑھے لکھے حضرات بآسانی استفادہ کر سکتے ہیں۔